مولانا غلام رسول مہر

اور

پاکستان اسکیم

مصنّف

پیر علی محمّد شاہ راشدی

مولانا غلام رسول مہر اور "پاکستان اسکیم"
ایک مطالعہ

قرارداد لاہور اور اس کے نتائج پر پہلا بے لاگ تبصرہ
اور چونکا دینے والے حقائق

مصنّف
پیر علی محمد شاہ راشدی

مرتب
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مجلس یادگار مہر
کراچی ۷۵۸۰۰

مولانا غلام رسول مہر اور "پاکستان اسکیم"
ایک مطالعہ

مولف : پیر علی محمد راشدی

مرتب : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ناشر : **مجلس یادگار مہر۔**
علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

طابع : المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ) قاری منزل
مراما اسٹریٹ۔ پاکستان چوک۔ کراچی ۷۴۲۰۰

اشاعت: نومبر ۱۹۹۲ء۔ مولانا مہر مرحوم کی بیسویں برسی کے موقع پر

قیمت :

ملنے کا پتہ

①
مکتبۂ رشیدیہ قاری منزل، پاکستان چوک۔ کراچی ۷۴۲۰۰

②
مکتبہ شاہد

علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

فہرست

پیش لفظ

مولانا غلام رسول اور پاکستان اسکیم

ایک مطالعہ

تالیف و ترتیب کی کہانی

پیر علی محمد شاہ راشدی مرحوم نے روزنامہ جنگ، کراچی میں بعض شخصیات، تحریکات اور افکار و مسائل کے حوالے سے بہت اہم مضامین اور بعض سلسلۂ مضامین لکھے تھے۔ ان میں سے ایک سلسلۂ مضمون وہ ہے جو انھوں نے مولانا غلام رسول مہر کے انتقال پر لکھا تھا۔

مولانا مہر مرحوم سے راشدی مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ وہ اپنی صحافتی زندگی کے ابتدائی زمانے سے واقف تھے لیکن قریبی تعلقات اور دوستانہ روابط کا آغاز ۱۹۳۸ء میں اس وقت ہوا جب وہ حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم کی دعوت پر صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس سے کچھ قبل کراچی تشریف لائے تاکہ اجلاس کے فیصلوں اور قراردادوں کے سلسلے میں مشورہ کیا جا سکے۔ اجلاس کے بعد راشدی صاحب نے لاہور کا سفر کیا تاکہ تقسیم ملک کے بارے میں کراچی اجلاس کی قرارداد کے لیے پروپیگنڈہ کیا جا سکے۔ اس زمانے میں دونوں کے تعلقات اور قریبی ہوگئے۔

۱۹۳۸ء میں صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے بعد مولانا مہر مرحوم نے حاجی سر عبداللہ ہارون کی فرمائش پر ایک کتابچہ لکھا تھا تاکہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے ہندوستان میں مسلمانوں کے موقف کا پروپیگنڈا کیا جا سکے۔ یہ کتابچہ لکھ کر مولانا نے مرحوم عبداللہ ہارون کو بھیج دیا۔ انھوں نے بقول ڈاکٹر شفیق احمد کے "مختلف زبانوں میں" ترجمہ کروا کے پیر علی محمد راشدی کی نگرانی میں طبع کرایا۔ اصلی

رسالہ جولائی ۱۹۳۹ء میں لاہور سے "سیاسیاتِ اسلامیانِ ہند" کے نام سے شائع ہوا۔ (صفحات ۶۸) تفصیل کے لیے دیکھیے "مولانا غلام رسول مہر — حیات اور کارنامے" از ڈاکٹر شفیق احمد، صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸ و ۴۴۴۔

اس کتابچے کے تراجم اور ان کی طباعت و اشاعت بھی راشدی صاحب اور مہر صاحب میں تعلقات میں استواری کا سبب بنی۔

۱۹۴۰ء میں انھیں ایک دوسرے سے اور قریب آنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں دونوں بزرگ مسلم لیگ کی سیاست کے پرجوش حامی تھے۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء تک دونوں کے افکار وخیالات میں کئی نشیب و فراز آئے۔ سیاسی راہیں دونوں کی مختلف ہوگئیں۔ لیکن دونوں کے دوستانہ تعلقات میں فرق نہ آیا۔ اور وہ انقلاب فکر جو راشدی مرحوم کی زندگی میں ۱۹۴۲ء کے بعد رفتہ رفتہ آیا تھا اور ۱۹۴۷ء تک پختہ ہوا تھا مولانا مہر مرحوم کی زندگی میں ۱۹۴۵ء سے شروع ہوا تھا، اور مسلم لیگ کے کابینہ مشن پلان کی منظوری نے اس پر پختگی کی مہر لگائی۔ ۱۹۴۶ء کے بعد دونوں بزرگ ایک ہی رائے پر قائم اور ایک ہی مسلک کے پابند ہو گئے۔ دونوں بزرگوں کے تعلقات کی استواری اور اعتماد کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ راشدی مرحوم کو خطرات نے گھیرا اور ان کی گرفتاری کا اندیشہ پیدا ہوا تو انھوں نے اپنے نہایت اہم، قیمتی اور نادر کاغذات اور بعض تاریخی ڈاکومنٹس مولانا مہر مرحوم کے پاس لاہور بھجوا دیے تھے جو مولانا کی وفات کے بعد تک ان کے گھر میں رہے۔ مولانا کے انتقال کے بعد اس امانت کو لوٹا دیا گیا۔

راشدی مرحوم سے مولانا مہر کے تعلق و محبت کے اور بھی کئی وجوہ تھے۔ حضرت پیر شاہ صبغت اللہ شاہ (اول) بانیِ تحریکِ اصلاح و جہاد کے سلسلے کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ حضرات سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے سفر جہاد میں حضرت پیر صاحبؒ نے قافلہ جہاد کی میزبانی کی تھی انھیں تحائف دیے تھے اور مجاہدین کی امداد فرمائی تھی۔ حضرت سید صاحبؒ کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے اہل خانہ کو پیر گوٹھ

میں حضرت شاہ صاحبؒ کی سرپرستی و نگرانی میں چھوڑ گئے تھے۔ اس تعلق سے مولانا مہر سندھ کے راشدی خاندان کے نیازمند تھے، اور حضرت پیر صبغت اللہ شاہ (ثانی) کے مجاہدانہ کارنامے، ملک کی آزادی اور ملت کی سربلندی کے لیے ان کی جاں نثاری نے انھیں اس خانوادے کا اور بھی عقیدت کیش بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ سندھ کی تاریخ سے ان کی دل چسپی نے پیر علی محمد راشدی کے اور قریب کر دیا تھا۔ مہر مرحوم نے سندھ کے کلہوڑہ عہد کی تاریخ لکھی تھی اس کی تالیف کے سب سے بڑے محرک علی محمد راشدی کے چھوٹے بھائی پیر حسام الدین راشدی تھے۔

ان مختلف وجوہ اور ذوق و فکر کے اشتراک نے ان بزرگوں کو آپس میں ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر کے انتقال پر راشدی مرحوم نے ایک سلسلۂ مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے مولانا سے اپنے تعارف، تعلقات اور دوستانہ روابط کی داستان بیان کی تھی۔ اس سلسلے میں بہت سی تاریخی باتیں آ گئی تھیں اور افکار و معلومات کا ایک ایسا مرقع تیار ہو گیا تھا جو دل چسپ بھی تھا اور فکر انگیز اور معلومات افزا بھی۔ مولانا مہر مرحوم کی زندگی، ان کے خصائص ذہن و فکر اور سیرت کے کچھ ایسے گوشے نمایاں ہوئے تھے جو راشدی مرحوم ہی کر سکتے تھے۔ کسی اور کا چوں کہ مولانا سے ایسا تعلق ہی نہ تھا اس لیے یہ سب کچھ لکھنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

مجھے چوں کہ مولانا مہر مرحوم سے عقیدت تھی اس لیے راشدی مرحوم کے ان مضامین کو محفوظ کرتا رہا۔ اور جب سلسلہ ختم ہوا تو میں نے ان مضامین کو کاغذ پر چسپاں کیا، کتابت و طباعت کی غلطیوں کو درست کیا، ان کے مباحث کو الگ الگ کیا۔ انھیں مختلف ابواب میں تقسیم کیا، جا بجا ذیلی عنوانات قائم کیے۔ ہر قسط کے شروع میں گزشتہ قسط سے مضمون کے ربط کے لیے کچھ سطور یا کوئی پیراگراف آتا تھا، اب چوں کہ یہ تمام مضامین ایک مرتب شکل میں ایک کتاب میں آ رہے تھے اس لیے قسط کے آغاز کی ربط کی عبارتوں کی ضرورت نہ تھی، انھیں حذف کر دیا۔ اس کے بعد پیر سید

حسام الدین راشدی کی خدمت میں یہ التماس درخواست پیش کی کہ وہ پیر سید علی محمد شاہ راشدی سے اس کی اشاعت کی اجازت دلوا دیں، پیر صاحب خاکسار کی اس کاوش تصحیح اور ترتیب و تبویب کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ ابھی یہ سلسلہ مکمل نہیں ہوا۔ وہ سلسلے کی تکمیل کے لیے چند قسطیں اور لکھنا چاہتے ہیں۔

اس وقت بعض واقعات و حوادث نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ فرصت کے انتظار میں تھے کہ اس طرف دوبارہ توجہ کر سکیں۔ کچھ عرصے کے بعد جب انھیں ایک بار توجہ دلائی تو اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن سے وہ بات تقریباً نکل چکی ہے، اور مضمون لکھنے کی کوئی قوی تحریک موجود نہیں۔ اس واقعے پر کئی سال گزر گئے۔ حتیٰ کہ یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو پیر سید حسام الدین راشدی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال سے میں اس وسیلے سے محروم ہو گیا جس نے مجھے مرحوم علی محمد راشدی کی بارگاہ میں پہنچایا تھا۔ پھر مارچ ۱۹۸۷ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا، اور ان کے چند اور مضمون لکھنے کی توقع ہی ختم ہو گئی۔

اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں اس نہایت مفید اور اہم سلسلہ مضمون کو اسی طرح کتابی شکل میں چھاپنے کا بندوبست کر دوں، جس صورت میں مرتب کر کے مرحوم راشدی برادران کو دکھایا تھا اور انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔

میرے لیے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں دُہری خوشی ہے:

اولاً: اس لیے کہ اس میں مولانا غلام رسول مہر کی شخصیت پر ایک دلفریب تبصرہ اور ان کے ذہنی و فکری اور اخلاقی کمالات اور خدمات کا اعتراف ہے۔

ثانیاً: یہ پیر علی محمد شاہ راشدی مرحوم کی ایک نادر اور یادگار تحریر ہے۔ جس میں انھوں نے تحریک آزادی وطن کے ایک اہم اور تاریخی واقعے کو قلم بند کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ مسلم لیگ کی خارجہ کمیٹی کی سب کمیٹی کے زیر اہتمام تیار ہونے والی پاکستان اسکیم بھی شامل کر دی ہے، جس کا ذکر اس کتاب کے کئی ابواب میں آیا

ہے۔ اس اسکیم کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسے مسلم لیگ کی مقررہ کردہ ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا اور مسلم لیگ ہی نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا تھا۔ راشدی مرحوم اس لاتعلقی اور بریت کے زندگی بھر ماتم گسار رہے۔

پاکستان اسکیم کی تالیف کے سلسلے میں یہ مسئلہ بھی سامنے آیا ہے کہ اس اسکیم کا واقعی مولف کون ہے؟ مولانا غلام رسول مہر یا پیر علی محمد راشدی؟ مولانا مہر مرحوم ۱۹۵۲ء میں یا اس سے قبل ۵۰ء۔ ۵۱ء میں جب کہ وہ "سید احمد شہید" کی تالیف میں مصروف تھے، اس مسئلے پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ "سید احمد شہید" (لاہور، ۱۹۵۲ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"پیر علی محمد راشدی ابتدا سے پبلک کاموں میں سرگرم حصّہ لیتے رہے ہیں۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم کی رفاقت میں لیگ کے خاص کارکن رہے۔ لیگ کی مجلس امورِ خارجہ کے سیکرٹری تھے اور اس زمانے میں انھوں نے لیگ کی قرارداد لاہور کے اصول کی بنا پر تقسیم ہند کی ایک اسکیم تیار کی تھی۔ نیز سندھ کی آزادی کے لیے بڑا ہی قابل قدر کام کیا۔" (ص ۲۱۰)

اسی طرح راشدی مرحوم نے واضح الفاظ میں اسے مولانا مہر کی تالیف قرار دیا ہے اور ایک جگہ نہیں کئی جگہ ایسا ہی اعتراف کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے باب چہارم کے آخر میں لکھتے ہیں:

(۱) مولانا مہر کی مرتب کردہ اسکیم کے مندرجات و خصوصیات کیا تھیں؟

(۲) مولانا والی اسکیم کو مسلم لیگ کے مرکز نے کیوں مخفی رکھنے کی کوشش کی..."

باب ششم کے شروع میں ان مطالب کو دہراتے ہوئے بحث کو آگے بڑھایا ہے اور لکھا ہے:

(۳) "مولانا مہر نے جو پاکستان اسکیم مرتب کر کے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کو عبداللہ ہارون مرحوم کے ذریعے بھیجی ....."

میرا خیال ہے کہ چوں کہ کمیٹی کے سیکریٹری راشدی مرحوم تھے، اس لیے اس کی تیاری کا کریڈٹ انھی کو جانا چاہیے تھا۔ مولانا مہر نے دراصل یہ کریڈٹ انھی کو دیا ہے۔ لیکن مولانا نے چوں کہ اس اسکیم کی تیاری میں سرگرمی اور شوق کے ساتھ حصّہ لیا تھا، راشدی مرحوم کے نزدیک ان کی خدمات کا اعتراف اسی طرح ممکن تھا کہ اس کی تالیف و ترتیب کا کریڈٹ مولانا مہر کو دیا جائے۔

اسی طرح دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کی خدمات اور محنت کا جو اعتراف کیا ہے، یہ ان کے اخلاص اور ایک دوسرے سے محبت کا بڑا ثبوت ہے۔

مناسب ہوگا کہ یہاں ایک غلط فہمی بھی دور کر دی جائے۔ اسکیم کی تیاری کے سلسلے میں کمیٹی کے اجلاس کئی مرحلوں میں ہوئے تھے۔

۱۔ پہلے دہلی میں ابتدائی صلاح و مشورہ ہوا۔

۲۔ پھر لاہور میں ۱۸۔ فروری ۱۹۴۰ء سے مسلسل سات دن تک سات اجلاس ہوئے، جن میں بیشتر اعداد و شمار پر کام ہوا۔ ان اجلاسوں کی روداد عزیزم امجد سلیم علوی کی عنایت سے خاکسار کو مہیا ہوئی۔

۳۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں بمقام دہلی اس کے کئی اجلاس ہوئے جن میں اسکیم کو آخری شکل دی گئی۔ اور اس کو "پاکستان اسکیم" کا نام دیا گیا۔

راشدی مرحوم کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروری ۱۹۴۰ء میں بھی کوئی تجویز یا سفارش مرتب ہوئی تھی، جس کی بنیاد پر قرارداد لاہور تیار کی گئی تھی۔ لیکن آخری رپورٹ تو ہے ہی ۲۳، دسمبر ۱۹۴۰ء کی۔ یہی حاجی سر عبداللہ ہارون نے صدر مسلم لیگ کو بھیجی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل کام قرارداد لاہور پاس ہونے کے بعد اس کی روشنی میں شروع ہوا تھا اور "پاکستان اسکیم" کی شکل میں سامنے آیا تھا، نہ کہ پاکستان اسکیم کی روشنی میں قرارداد لاہور مرتب ہوئی تھی یا اس اسکیم سے قرارداد لاہور میں انحراف کیا گیا تھا، اور اس کے نتیجے میں وہ واقعات پیش آئے جنھوں نے پاکستان کو اسکیم کے مقاصد سے دور کر دیا تھا۔

ایک ایسی تحریر میں، جو تاریخ وقوعہ کے تقریباً ۳۲ برس بعد لکھی گئی ہو، ایسی غلطیوں کا واقع ہو جانا ہرگز بعید از قیاس نہیں۔ لیکن امید ہے کہ اس تحریر (اس کتاب) کے ساتھ اصل پاکستان اسکیم کی شمولیت سے غلط فہمی یا تسامحات رفع ہو جائیں گے۔

پاکستان اسکیم سے انحراف کا حادثہ ضرور پیش آیا، لیکن قرار داد لاہور کی تالیف کے وقت نہیں بلکہ اسکیم کے مقاصد سے دوری کا یہ حادثہ رفتہ رفتہ اس طرح پیش آیا کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم کے منصوبے کو تسلیم کیا گیا تو پاکستان اسکیم اور ۳ جون کے اعلان میں اشتراک مقاصد کا کوئی تعلق نہ تھا۔

راشدی مرحوم نے اس حادثے کا ذکر بڑی دل سوزی کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے باوجود بعض طبائع کو بہت گراں گزرا جس کا اظہار بہت تلخ لہجے میں ہفت روزہ چٹان (لاہور ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء) کے شمارے میں کیا گیا۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے، اور ہمارے قلب کی کوئی رنجش اور زبان کی تلخی نتائج کی سنگینی کو نہ مٹا سکتی ہے نہ کم کر سکتی ہے۔

اس اسکیم کی فراہمی کے سلسلے میں مولانا مہر مرحوم کے صاحبزادے جناب امجد سلیم علوی کا شکر گزار ہوں۔ یہ اسکیم ابھی نایاب تھی۔ اس کی دریافت کی ایک الگ کہانی ہے۔ اصل اسکیم انگریزی میں تھی۔ میں اس کے ترجمے کی اشاعت ہی کافی سمجھتا تھا۔ برادرم محترم مشفق خواجہ کا صائب مشورہ یہ ہوا کہ اصل (انگریزی) کو ضرور شامل کرنا چاہیے اس لیے کہ حوالے کی چیز وہی ہے۔ چنانچہ ترجمے کے ساتھ اصل انگریزی متن کا عکس بھی شامل کیا جاتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے چوں کہ مولانا غلام رسول کے سوانح شخصیت کے بعض دیگر پہلوؤں اور علمی خدمات کا پتہ نہیں چلتا ہے اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کے سوانح و خدمات کے بارے میں چند ضروری اشارات مرتب کر دیے جائیں۔ اسی طرح چوں کہ اس کتاب کے مصنف پیر علی محمد شاہ راشدی کے حالات میں ابھی تک اردو میں کوئی کتاب مرتب نہیں ہوتی ہے اور ان کی شہرت کے باوجود ان کے حالات سے واقفیت بہت کم ہے۔ اس لیے ان کے حالات کا سرسری تعارف بھی کرا دینا ضروری سمجھا گیا۔

امید ہے کہ قارئین کرام کتاب کے ساتھ ضمیمے اور ان اضافات کو بھی پسند فرمائیں گے۔

ابوسلمان شاہجہان پوری یکم مارچ ۱۹۹۲ء

مصنّف

پیر علی محمد شاہ راشدی

(ایک سرسری تعارف)

پیر علی محمد راشدی ملک کے چند ذہین اور جہاں دیدہ ارباب سیاست میں سے تھے۔ انھوں نے صحافت اور سندھی ادب میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے اور سیاست میں بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔ سندھ میں صحافت کی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ تقریباً بیس برس کی عمر میں صحافت ہی سے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور زندگی کے آخری ایام تک صحافت سے ان کا تعلق رہا تھا۔

صحافت کی راہ سے وہ سیاسی میدان میں آئے تھے، اور زندگی کے مختلف ایام و ادوار میں وہ صوبائی اور قومی اسمبلیوں، وزارتوں، سفارتوں، مشاورت اور بعض اداروں کی صدارت کے عہدوں پر فائز رہے۔

صحافت ہی نے تصنیف و تالیف کی طرف ان کی رہنمائی کی تھی۔ ان کے وسیع علمی مطالعے، زندگی کے تجربے اور ملک اور بیرون ملک کے سفروں اور مشاہدوں نے ان میں بصیرت و دانائی، نظر میں وسعت اور فکر میں بلندی اور گہرائی کی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ یہ خوبیاں راشدی مرحوم کی تحریروں میں بھی موجود ہیں۔

خاندان و پیدائش:

پیر علی محمد کا تعلق سندھ کے راشدی خاندان سے تھا۔ ان کے والد ماجد پیر حامد شاہ علیہ الرحمہ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چوتھی پشت میں پیر محمد راشد روضۂ دھنی سے مل جاتا ہے۔ جن کی نسبت سے خاندان کی دونوں شاخیں "راشدی"

کہلاتی ہیں[1]۔ پیر صبغت اللہ شاہ ثانی شہید (شہادت ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء) کی سگی پھوپھی (پیر شاہ مردان شاہ کوٹ دھنی کی سگی بہن) شاہ پیر شاہ کی اہلیہ، پیر حامد شاہ راشدی کی والدہ اور پیر علی محمد شاہ راشدی کی جدہ ماجدہ (دادی) تھیں۔

پیر علی محمد شاہ راشدی ۵۔ اگست ۱۹۰۵ء کو ضلع لاڑکانہ (سندھ) کے ایک گوٹھ بہمن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد پیر حامد شاہ راشدی (ف ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء) کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے ہمارے ممدوح پیر علی محمد شاہ، اور منجھلے بیٹے سندھی اور اردو کے مشہور مصنّف، محقق اور مورّخ پیر حسام الدین شاہ راشدی (ف یکم اپریل ۱۹۸۲ء) تھے، اور تیسرے بیٹے پیر احمد شاہ راشدی۔

تعلیم اور قابلیت :

پیر علی راشدی نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ خاندان کی روایت کے مطابق گھر میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی سندھی فارسی کی تعلیم کے سلسلے میں مولوی محمد سومار اور مولوی محمد صدیق اور انگریزی تعلیم کے باب میں ماسٹر محمد رفیق کے نام مولانا اعجاز الحق قدوسی نے لکھے ہیں۔ رسمی تعلیم صرف چھٹی جماعت تک ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ علم حاصل کیا تھا وہ ذاتی مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ اور صرف اپنے شوق مطالعہ کی بدولت ادب اور متعدد علوم عمرانیات میں غیر معمولی قابلیت پیدا کر لی تھی۔

انھیں متعدد زبانوں میں رسوخ حاصل تھا۔ عربی سے واقف تھے، فارسی میں

---

[1] راشدی خاندان کی دو شاخیں ہیں: ۱۔ پیر پگاڑا (پگڑی یا دستار والے)۔ ۲۔ پیر جھنڈا (جھنڈے یا عَلَم والے) علی محمد راشدی کا خاندان پگڑی والے پیروں کے خاندان کی ایک شاخ ہے جو پیر صبغت اللہ شاہ اول (تجر دھنی) کے چھوٹے بیٹے پیر علی محمد شاہ (ف ۱۲۸۴ھ) سے شروع ہوتی ہے۔ گدی نشینی کا سلسلہ پیر صبغت اللہ شاہ اوّل (ف ۱۲۴۶ھ) کے بڑے بیٹے پیر علی گوہر شاہ (ف ۱۲۶۳ھ) کے خاندان میں جاری ہوا۔

خاصی استعداد رکھتے تھے، سندھی زبان کے بلند پایہ ادیب تھے۔ وہ انگریزی زبان کے بہترین رائٹر تھے۔ اردو میں بھی وہ بہت اچھا لکھتے تھے۔ اردو نہ ان کی مادری زبان تھی نہ انھوں نے اسے بہ طور ایک علم کے سیکھا تھا، لیکن ان کی اردو تحریریں تذکیر و تانیث، واحد، جمع اور قواعد کی اُن کی بہت سی غلطیوں سے پاک ہیں جو غیر مادری زبان کے لکھنے والوں میں عام طور پر نظر آجاتی ہیں۔ ان کا خاص مضمون سیاست تھا۔ زندگی کے طویل تجربے، مشاہدے اور مطالعے نے ان کی تحریروں کو فکر انگیز اور بصیرت افروز بنا دیا ہے۔ وہ وقت کی رفتار، گرد و پیش کے تقاضوں اور حالات کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ انھیں بات کہنے کا سلیقہ آتا تھا اور وہ کسی شخص کے جذبات کو ٹھیس لگائے اور قلب کو صدمہ پہنچائے بغیر سخت سے سخت بات کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ البتہ نج کی مجلسوں میں وہ عام طور پر کسی ذہنی تحفّظ کے بغیر بڑی بے باکی کے ساتھ صاف صاف گفتگو فرماتے تھے۔

عملی سیاست:

پیر علی محمد راشدی مرحوم اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ انھوں نے مختلف حالات میں جو مسلک بھی اختیار کیا تھا وہ اس میں مخلص تھے۔ کانگریس کی حمایت کی، سندھ اتحاد پارٹی کا ساتھ دیا، مسلم لیگ کی معاونت کی، سندھ مسلم لیگ کے اجلاس کراچی (١٩٣٨ء) کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، پاکستان اسکیم کی تیاری کے لیے کام کیا، سردار محمد امین خان کھوسو کو کانگریس کے ٹکٹ پر ضمنی انتخاب لڑوایا، سر ابراہیم رحمت اللہ کی لیگی وزارت کے لیے سرگرم کار ہوئے، خان بہادر محمد ایوب خان کھوڑو کی سیاست میں ان کا ساتھ دیا، جناب جی۔ ایم سید کے خلاف مسلم لیگ کی مہم میں سید صاحب کا ساتھ دیا۔ وہ ہر تحریک میں اور ہر مقام پر مخلص اور پر جوش رہے، اور یمین و یسار سے بے نیاز اور عواقب و نتائج سے بے پروا ہو کر کام کیا۔ اور اپنی بصیرت اور ذوق کے مطابق صحافت، عملی سیاست اور تصنیف و تالیف

کے ذریعے زندگی بھر وطن اور اہلِ وطن کی خدمت میں مصروف رہے۔

ایک صحافی کی حیثیت میں عملی سیاست سے ان کا ہمیشہ تعلق رہا، لیکن قیامِ پاکستان کے بعد صحافت کے مقابلے میں عملی سیاست سے ان کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۵۳ء سے ۵۵ء تک سندھ کے ریونیو منسٹر رہے، اور نائب وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اپنی وزارت کے زمانے میں انھوں نے جاگیردارانہ نظام پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس ظالمانہ نظام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ اس میں انھیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن بعد میں آنے والی حکومتوں کی عدم دل چسپی اور مخالف اندازِ فکر کی وجہ سے ان کے تمام کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔

وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی چنے گئے۔ چودھری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں مرکزی وزیرِ اطلاعات مقرر ہوئے۔ ۵۷ء سے ۶۱ء تک فلپائن میں پاکستان کی سفارت کے فرائض انجام دیے۔ ۶۱ء میں عوامی جمہوریہ چین میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے اور ڈیڑھ سال تک خدمات انجام دیں۔ ۶۲ء میں اس خدمت سے انھوں نے سبک دوشی اختیار کر لی۔ چین میں ان کے دورِ سفارت کا اہم واقعہ پاک چین سرحدی معاہدہ ہے۔ جس کے جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست پر بہت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔

تقریباً چھ ماہ تک مشرقِ وسطیٰ میں سفیر کی حیثیت سے پاکستان کے مفادات کی نگرانی اور علاقائی سیاست میں پاکستان کے خیالات کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

۱۹۷۲ء میں پیپلز پارٹی کے پہلے دورِ حکومت میں انھیں مشیر برائے اطلاعات مقرر کیا گیا۔ وہ کچھ عرصہ پاکستان نیشنل سنٹر کے چیئرمین بھی رہے تھے۔

بہ طورِ واقعہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مرحوم علی محمد راشدی کی ذہانت، اور ان کے علم اور تجربے سے سندھ اور پاکستان کی تعمیر میں بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا

تھا، لیکن تقریبًا ہر حکومت نے انھیں استعمال کرنے کی کوشش تو کی، ان کی ذہانت اور علم و تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اکثر نے انھیں نظر انداز کیا۔ انھیں جو مناصب سونپے گئے، اور ان سے جو خدمات لی گئیں وہ ان مناصب اور ان خدمات سے کہیں زیادہ بلند اور اہم مناصب اور خدمات کے اہل تھے۔

صحافت:

پیر علی محمد راشدی سندھ کے نامور صحافی تھے۔ انھوں نے سندھی زبان کے متعدد رسالے اور اخبار خود بھی نکالے، اور دوسروں کے اخبارات کو ایڈٹ بھی کیا۔ صحافت میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ صحافت ہی کے ذریعے وہ سیاست میں آئے اور صحافت ہی نے ان کی رہنمائی تصنیف و تالیف کے میدان میں کی تھی۔

۱۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انھوں نے سندھ نیوز اخبار کی نامہ نگاری سے کیا تھا۔ یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے۔ اسی سال اپنے گاؤں سے ماہنامہ الراشد کو جاری کیا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ وہ رسالہ الامین سکھر کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

۲۔ ۱۹۲۶ء میں ماہنامہ الحزب نکالا اور اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ الراشد، الحزب اور الامین کے اجرا کی تاریخوں میں کچھ اختلاف ہے، لیکن مولانا اعجاز الحق قدوسی مرحوم اور شاہد راشدی اس باب میں متفق ہیں کہ یہ ۲۵ تا ۲۸ء کے واقعات ہیں۔

۳۔ ۱۹۲۹ء میں "سندھ زمیندار" اخبار سکھر سے جاری ہوا۔ پیر صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مولانا قدوسی مرحوم کے بہ قول راشدی صاحب نے کچھ دن اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ اخبار ہندو مسلمان زمینداروں کا ترجمان تھا۔

۴۔ ۱۹۳۳ء میں "ستارہ سندھ" کے نام سے انھوں نے اپنا اخبار سکھر سے جاری کیا۔ اس اخبار نے بمبئی پریسیڈنسی سے سندھ کی علاحدگی اور مستقل صوبہ بنائے جانے کی تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا، راشدی مرحوم اسی کے ایڈیٹر

بھی تھے اور مینجنگ ڈائرکٹر بھی ۔ یہ اخبار پہلے بائی ویکلی تھا پھر ویکلی ہو گیا۔

۵۔ ۱۹۳۶ء میں بمبئی سے سندھ کی علاحدگی اور آزادی کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ نئے حالات میں سندھ کی رہنمائی کی جائے اور اس کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس وقت کراچی سندھ کا صرف ایک اہم شہر ہی نہ تھا بلکہ صوبے کا صدر مقام اور دارالحکومت بھی بن گیا تھا چناں چہ ایک نیا اخبار روزنامہ "صبح سندھ" کے نام سے کراچی سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر راشدی مرحوم مقرر ہوئے۔ یہ اخبار سندھ اتحاد پارٹی کا ترجمان تھا جس کے رہنما سر شاہنواز بھٹو اور حاجی سر عبداللہ ہارون تھے۔ اس اخبار نے سندھ کی تعمیر و ترقی میں بہت خدمات انجام دیں۔

۶۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۷ء کے انتخابات سے قبل راشدی صاحب نے الیکشن میں حصہ لینے والی پارٹیوں اور ان کے امیدوار کے پروپیگنڈے کے لیے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مقصد سندھ کے عوام میں سیاسی شعور کی بیداری اور ان کی سیاسی تربیت ہو گا قدوسی مرحوم نے اس اخبار کا نام نہیں لکھا۔

یہ تمام اخبار اور رسائل سندھی زبان میں تھے۔

۷۔ ۱۹۴۰ء کے بعد جب ملک کی تحریک آزادی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی تو چوں کہ اس دور میں سیاست کا انداز پچھلے دور سیاست سے بالکل بدل چکا تھا۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک نیا اخبار نکالا جائے۔ چناں چہ "مسلم وائس" کے نام سے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

۳۸ء کے اواخر سے راشدی صاحب مرحوم چوں کہ رفتہ رفتہ مسلم لیگ کے ہم خیال ہو گئے تھے اور مسلم لیگ کی خارجہ کیٹی کی سب کمیٹی جو سر عبداللہ ہارون کی صدارت میں قائم ہوئی تھی تاکہ ملک کے سیاسی فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں مختلف افکار و تجاویز کا جائزہ لے کر ایک نئی اور جامع اسکیم مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے سیکریٹری

پیر علی محمد راشدی تھے۔ ۱۹۴۰ء کے آخر میں کمیٹی نے اپنی آخری رپورٹ مرتب کر کے پیش کر دی تھی۔

۱۹۴۱ء میں راشدی مرحوم نے "مسلم وائس" کی زمام ادارت ہاتھ میں لی تو کمیٹی کی پیش کردہ اسکیم کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنا اور سیاسی فضا کو سازگار بنانا مقصود تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی قیادت نے اس اسکیم سے کسی وجہ سے بریت کا اظہار کر دیا۔ اس طرح "مسلم وائس" کی زمام ادارت ہاتھ میں لینے کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ چناں چہ راشدی صاحب نے اس کی ادارت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مولانا قدوسی مرحوم نے لکھا ہے کہ مسلم وائس کی ادارت سے راشدی صاحب کا بہت تھوڑے عرصے تعلق رہا تھا۔

۸۔ پاکستان اسکیم کی تیاری میں راشدی مرحوم نے بہت محنت کی تھی۔ لیگی قیادت کی اس سے بریت کے واقعے نے ان کے قلب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم لیگ کے رہنماؤں سے مایوس ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محترم جی۔ ایم۔ سید کا مسلم لیگ سے اختلاف ہوا، اور ان کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا تو مرحوم راشدی صاحب نے حضرت سید صاحب کا ساتھ دیا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:

"۱۹۴۵ء میں جب جی ایم سید کا اختلاف مسلم لیگ سے ہوا اور اخبار "الوحید" نے جی ایم سید کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا تو راشدی صاحب جی۔ ایم سید کی حمایت کے لیے اخبار "قربانی" اور اس کا پریس خرید کر کراچی آئے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مولوی خیر محمد نظامانی تھے، لیکن کچھ دن کے بعد اس بنا پر کہ مولوی نظامانی پارٹی کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے تھے۔ اخبار کی نگرانی اور ایڈیٹری پیر علی محمد شاہ راشدی کے سپرد ہوئی۔ البتہ اخبار کی نگرانی اور ایڈیٹری میں نام دونوں کا ہوتا تھا لیکن اہم مضامین اور ایڈیٹوریل پیر علی محمد راشدی صاحب ہی لکھتے تھے۔"

۹۔ قیام پاکستان سے پہلے کچھ عرصہ تک مشہور کانگریسی اخبار بمبئی کرانیکل بمبئی کے ادارتی فرائض بھی انجام دیے تھے۔

۱۰۔ ان کی صحافت کا عہد آفریں دور تو "مسلم وائس" کی ادارت پر ختم ہو گیا تھا، لیکن قیام پاکستان کے دو سال بعد جب وہ ۱۹۴۹ء میں ڈیلی "سندھ آبزرور" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ایک بار پھر صحافت کی گرم بازاری پیدا ہو گئی تھی۔ سندھ آبزرور کی ادارت کے بعد انھوں نے کسی اخبار کی زمام ادارت اپنے ہاتھ میں نہیں لی۔ البتہ جنگ، کراچی اور عبرت، حیدر آباد میں انھوں نے آزاد صحافی کی حیثیت سے کالم نگاری ضرور کی اور اپنے وقت کے بہت کامیاب کالم نویس ثابت ہوئے۔

سندھ آبزرور کی ادارت کے زمانے میں وہ پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹر کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صحافت کی سطح پر ہندوستان پاکستان کے مابین خیر سگالی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں اور ایک حقیقت پسندانہ متحدہ نقطۂ نظر پیدا کرنے میں اہم حصہ لیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ڈھاکا، کلکتہ، دہلی وغیرہ کا سفر بھی کیا تھا۔ لیاقت نہرو معاہدے کے لیے فضا کو سازگار بنانے میں انھوں نے ایک نمایاں کردار ادا کر کے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمات انجام دی تھی۔ لیاقت نہرو معاہدے کے تحت پاک و ہند کے ایڈیٹروں کی جو متحدہ کمیٹی بنی تھی، راشدی مرحوم کو اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے صحافت کے میدان میں ان کی کل ہند حیثیت کا اعتراف تھا۔

سیاسی زندگی کے ہنگاموں اور سفارت اور وزارت کی دنیا سے پلٹنے کے بعد انھوں نے اپنا تو کوئی اخبار نہیں نکالا، اور نہ کسی اخبار کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی، لیکن صحافت سے بالکل قطع تعلق بھی نہیں کیا تھا۔ اس دور میں انھوں نے کالم نگاری کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ روزنامہ عبرت حیدر آباد میں انھوں نے ایک مدت کا "رندم پند" کے عنوان سے کالم لکھا۔ روزنامہ جنگ کراچی میں وہ زندگی کے آخری

ایام تک کالم لکھتے رہے تھے۔ پہلے ان کا کالم "مکتوب مشرق" کے عنوان سے ہوتا ہے۔ پھر "مشرق و مغرب" کے عنوان سے چھپنا شروع ہوا۔ "وغیرہ وغیرہ" کے عنوان سے ہلکے پھلکے طنزیہ اور فکاہی کالم بھی لکھے۔

پیر علی محمد راشدی بلاشبہ ہند پاکستان کے ایک بڑے اور کامیاب صحافی تھے۔

تصانیف :

پیر علی محمد راشدی ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ تاریخ و سوانح اور سیاسیات میں ان کی متعدد تصانیف سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں میں یادگار ہیں۔

۱۔ اھي ڈيھن اھي شينھن (وہی دن وہی شیر) تین جلدوں میں ایک یادگار اور اپنی نوعیت کی بے نظیر تصنیف۔ مختلف شخصیات کے بارے میں مرحوم کی یادوں اور تاثرات کا مجموعہ۔

۲۔ خط و مضمون : پیر صاحب مرحوم کے تعلقات بہت وسیع تھے ان کے حلقہ احباب میں ہر فکر و مسلک اور ہر دائرہ علم و عمل کے لوگ شامل تھے۔ سیکڑوں اشخاص سے ان کا مراسلت کا تعلق تھا۔ ایک بڑے صحافی اور کالم نگار ہونے کے رشتے سے سیکڑوں غیر واقف حضرات بھی انھیں خطوط لکھتے رہتے تھے۔ راشدی مرحوم کے نام رنگارنگ خطوط کا یہ مجموعہ افکار و معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

۳۔ رند و پند : یہ کتاب پیر صاحب کے ان کالموں کا مجموعہ ہے جو ۶۸، ۶۹ء میں روزنامہ عبرت حیدر آباد (سندھ) میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سیکڑوں افکار و معلومات ہیں اور بہت سے علمی، تہذیبی، تاریخی مسائل زیر بحث آئے ہیں، جن سے سندھ اور پاکستان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی رجحانات اور مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۴۔ فریادِ سندھ : اس نام سے راشدی مرحوم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین پہلے اخبار "قربانی" میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا قدوسی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ راشدی صاحب کی کتاب ہے جو پہلے قسط وار مضامین کی صورت میں اخبار "قربانی" میں چھپی تھی۔ اس وقت لیگی رہنماؤں کے طرزِ سیاست سے سندھ

لے مفادات اور تشخص کو جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور مسائل میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان پر راشدی مرحوم کی صدائے درد انگیز نے "فریاد سندھ" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ راشدی مرحوم نے بہت بے باکی کے ساتھ حالات و مسائل پر اظہار رائے کیا تھا۔ سندھ کی تاریخ سیاست کے مطالعے میں یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

۵۔ روداد چمن: پاکستان کو اس کے ملازمین، اس کے جاگیرداروں، سرمایہ داروں وغیرہ نے کس طرح لوٹا اور اس کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو کس طرح تباہ کیا، اس کتاب میں ان حالات پر اور نوکر شاہی اور وڈیرہ شاہی کی جوڑ توڑ اور سازشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں راشدی مرحوم نے "پرانی اور بھولی ہوئی باتیں" کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں لکھے تھے۔ تمام مضامین فکر انگیز اور معلومات افزا ہیں۔

۶۔ اسٹوری آف سفرنگ آف سندھ۔ انگریزی زبان میں راشدی مرحوم کی یہ کتاب سندھ کی مظلومیت، محرومی اور استحصال کی تاریخ ہے۔

راشدی مرحوم کی تمام تصنیفات پاکستان خصوصاً سندھ کی تاریخ سیاست کے مطالعے میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

انتقال:

ان کی عمر پورے بیس برس کی نہ ہوئی تھی جب انھوں صحافت کے کوچے میں قدم رکھا تھا اور عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ تقریباً تریسٹھ برس تک ایک بھرپور صحافتی، سیاسی اور علمی زندگی گزار کر راشدی خاندان کا یہ لعل شب چراغ ۱۴۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو عدم کی تاریکیوں میں ہمیشہ کے لیے چھپ گیا۔ اُن کے انتقال کا حادثہ کراچی میں پیش آیا تھا، اور میوہ شاہ کے تاریخی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالےٰ ان کی روح کو سکون و راحت ابدی نصیب کرے اور مراتب بلند فرمائے۔

مولانا غلام رسول مہر

(چند سوانحی اشارات)

خاندان اور تعلیم :

مولانا غلام رسول مہر ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو پھول پور ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پھول پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو جالندھر شہر سے ۶ میل کے فاصلے پر جنوب میں آباد ہے، ان کے والد کا نام چودھری محمد علی خاں تھا، مہر صاحب ابھی گیارہ برس کے تھے کہ ان کے والد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم چار بہن بھائی تھے، وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹی بہن تھیں، ان سے چھوٹے بھائی تھے جن کا نام امیر احمد خاں تھا۔ والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۵ سال کی تھی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں انتقال ہوا۔ دوسری بہن امیر احمد سے چھوٹی تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں ۱۳، ۱۴ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ مہر صاحب کے والد نے اپنے انتقال سے پیشتر ان کی والدہ اور ان کے ماموں کو صرف یہ وصیت کی تھی کہ غلام رسول کی تعلیم میں فرق نہ آئے۔ مہر صاحب کے والد علاقے کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مہر صاحب کو خاصی زمین ورثے میں ملی تھی۔ والدہ نے اپنے مرحوم شوہر کے انتقال کے بعد ایک خاص طریقے سے زندگی بسر کرنی شروع کی، وہ معمولی لباس پہنتیں، سادہ غذا استعمال کرتیں، اکثر روزے رکھتیں، اس وجہ سے ان کی صحت پر بھی خاصا اثر پڑا۔ ان کی یہ سادگی صرف اس وجہ سے تھی کہ مرحوم شوہر کی وصیت کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے۔ حالاں کہ اس زمانے میں تعلیم کے بہت اخراجات ہونے کے باوجود اس قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ ان

کے اچھا کھانے اور اچھا پہننے سے معاشی حالات متاثر ہوں اور وصیت کا پایۂ تکمیل کو پہنچانا مشکل ہو۔ لیکن وہ ایک خاص عزم اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ انھوں نے شوہر کے انتقال کے بعد زندگی کی ایک خاص وضع اختیار کر لی تھی اور اس پر اس وقت بھی قائم رہیں جب مہر صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد ملازم ہو گئے تھے اور ان کی اپنی بھی اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مہر صاحب کو ان کے سایۂ شفقت اور بے غرض ترین دعاؤں سے اپنی محرومی کا بہت افسوس ہوا اور یہ احساس ان کا آخر وقت تک قائم رہا۔ مہر صاحب کی تعلیم و تربیت میں مرحومہ کا بڑا حصّہ تھا۔ مہر صاحب کی تعلیم کی ابتدا گاؤں کے مکتب سے ہوئی۔ میٹرک مشن ہائی اسکول جالندھر سے پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے جہاں انھوں نے اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۳ء میں انٹرمیڈیٹ کیا اور مئی ۱۹۱۵ء میں وہ بی۔اے کے امتحان سے فارغ ہوئے۔

مولانا آزاد سے تعلق و عقیدت:

۱۹۱۳ء میں جب کہ وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی جماعت "حزب اللہ" کے رکن بنے۔ اس وقت تک وہ مولانا آزاد سے متاثر نہیں تھے۔ دوستوں پر اعتماد تھا، انھوں نے حزب اللہ کی رکنیت کا فارم پیش کیا، مہر صاحب نے دستخط کر دیے۔ لیکن اس کے بعد جب انھوں نے الہلال کا مطالعہ کیا تو ان کی اسلامی و سیاسی دعوت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی زمانے میں مولانا مرحوم سے خط و کتابت بھی شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۴ء میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس دن سے ارادت اور عقیدت کا نقش اور گہرا ہو گیا۔ اور اگرچہ تقریباً نصف صدی کی مدت میں بہت سے مسائل میں ان کی رائے سے شدید اختلاف بھی کیا، لیکن یہ رشتۂ ارادت اور تعلقِ عقیدت ہر حالت میں محفوظ رہا۔

مولانا، آزاد کے علم وفضل، ان کے تدبر اور ان کی نظر و بصیرت کے بہت معترف تھے اور یہ صرف ابتدائی دَور کا تاثر نہ تھا بلکہ زندگی کے ہر آنے والے دَور میں وہ اس پر زیادہ مستحکم ہوتے گئے۔ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب مولانا آزاد نے الہلال کی بندش کے بعد البلاغ جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی کلکتے میں منتخب نوجوانوں اور قومی و دینی کارکنوں کو قرآن حکیم کے درس اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مرکز "دار الارشاد" کے نام سے قائم کیا تو مہر صاحب نے ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ دن مولانا مرحوم کی صحبت میں گزاریں گے۔ لیکن البلاغ کے اجرا اور "دار الارشاد" کے قیام کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ مارچ ۱۹۱۶ء میں انھیں حدود بنگال سے نکل جانے کا حکم ملا۔ مولانا رانچی چلے گئے۔ پھر وہیں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ نظر بندی جنوری ۱۹۲۰ء تک جاری رہی۔ مولانا مرحوم کے کلکتہ چھوڑنے سے "البلاغ" اور "دار الارشاد"، کا سارا انتظام اور منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ اس طرح مولانا آزاد کی ذات بابرکات سے استفادے کی جو آرزو مولانا مہر مرحوم کے دل میں موجزن تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔

حیدر آباد (دکن) کا سفر:

جنگ عظیم چھڑ چکی تھی، ملک کے سیاسی حالات انتہائی دگرگوں تھے۔ مولانا آزاد مرحوم کی رہائی کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہ تھی کہ ان سے استفادے کے لیے وقت کا انتظار کیا جائے۔ ملک جن سیاسی حالات سے گزر رہا تھا، ان میں اخبار نکالنے کی آرزو بھی پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی یعنی بہ حالت موجودہ صحافت کے میدان میں آنے اور ملک وملت کی خدمت کرنے کے لیے بھی فضا سازگار نہ تھی۔ لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور بے مصرف زندگی کے روز و شب بسر کرنا بھی گوارا نہ تھا، اس لیے حیدر آباد دکن کے لیے رخت سفر باندھا اور پایہ گاہ وقار الامرا کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے، جہاں چھ سال تک انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت

سے خدمات انجام دیں۔

حیدر آباد سے واپسی اور زمیندار، لاہور سے تعلق:

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہائی ملی۔ اخبارات پر سے بھی پابندیاں اُٹھائی جانے لگیں اور سختیاں کم ہوئیں اور ملک و ملت کی خدمت کا ایک میدان نظر آیا تو مہر صاحب نے حیدر آباد دکن سے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔ کسی حد تک حیدر آباد چھوڑنے کی یہ وجہ بھی ہوئی کہ مولانا آزاد مرحوم کی گرفتاری کے بعد خانہ تلاشی میں "حزب اللہ" کے ارکان کا ایک رجسٹر بھی پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس میں مہر صاحب کا نام بھی تھا۔ پولیس نے پھول پور سے لے کر حیدر آباد دکن تک ان کا تعاقب کیا۔ اس بات سے حیدر آباد کی مخصوص فضا میں ان کے لیے اطمینان و ترقی کے مواقع باقی نہیں رہے تھے۔ واپسی کے بعد ان کا ارادہ اخبار نکالنے کا تھا لیکن بعض دوستوں کے مشورے سے پہلے ایک خاص مدت تک کسی اخبار میں کام کرنے اور تجربہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں وہ زمیندار کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن مہر صاحب کے عزیزوں کو خصوصاً والدہ ماجدہ کو زمیندار سے ان کا یہ تعلق گوارا نہ تھا۔ کسی ایسے اخبار کی ادارت، جو گورنمنٹ کی ترجمانی کی جگہ ملک و ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے گورنمنٹ سے حریفانہ نبرد آزما ہو، آزمائش سے خالی نہ تھی۔ والدہ ماجدہ کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کی امیدوں کا سہارا کسی خطرے سے دو چار ہو۔ وہ مزاحم ہوئیں، اور مہر صاحب نے ان کے جذبات کے احترام میں اس تعلق کو منقطع کر لیا۔ مہر صاحب کے قطع تعلق کے چند روز بعد زمیندار سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی اور پندرہ بیس روز تک اخبار بند رہا۔ ضمانت داخل کر دینے کے بعد جب زمیندار دوبارہ جاری ہوا تو ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے احباب نے مہر صاحب کے اعزہ اور والدہ ماجدہ کو راضی کر لیا، اور مہر صاحب اوائل فروری ۱۹۲۲ء میں دوبارہ زمیندار میں

آ گئے۔

انقلاب، لاہور کا اجرا:

ابتدا میں مہر صاحب کا ارادہ اپنا اخبار نکالنے کا تھا لیکن زمیندار سے وابستہ ہونے کے بعد خیال ترک کر دیا، اس لیے کہ مقصود خدمت حق تھا، اور اس کے لیے زمیندار میں مناسب مواقع موجود تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ زمیندار سے ان کے لیے تعلق رکھنا مشکل ہو گیا۔ شفاعت اللہ خاں بہت پہلے الگ ہو چکے تھے۔ سالک مرحوم نے رخصت لے لی تھی۔ مہر صاحب نے بھی رخصت کے لیے درخواست دے دی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو مہر صاحب و سالک کی علاحدگی منظور نہ تھی لیکن خواہش و عزم کے باوجود انھیں حالات کی درستی پر بھی قابو نہ تھا، اس کے باوجود مہر و سالک نے ان کی خواہش کا احترام کیا، اور اخبار سے قطع تعلق کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر مارچ ۱۹۲۷ء میں اچانک ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ دونوں مرحومین کو بیک وقت استعفا دینا پڑا۔ اور ان کی جانب سے کسی تحریک کے بغیر باقی عملے کا بیشتر حصہ بھی زمیندار سے الگ ہو گیا۔ عملے میں اڈیٹر، مترجم، کاتب، پروف ریڈر وغیرہ سبھی لوگ تھے۔ اس صورت حال نے اخبار نکالنے کی تحریک پیدا کر دی، اور ایک ہفتے کے اندر اخبار کے اجرا کا بندوبست کر لینا پڑا۔ یہ نیا اخبار "انقلاب" کے نام سے جاری ہوا جس کا پہلا پرچہ ۴ر اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔ صفحۂ اوّل حضرت علامہ اقبال کی ایک نظم سے آراستہ کیا گیا تھا جس کا پہلا بند یہ ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

"انقلاب" تقریباً ساڑھے بائیس برس جاری رہا۔ اس نے خالص سیاسی، انتظامی

اور دستوری مسائل پر مفصل مباحث کا آغاز کیا - ترک موالات کے دور میں جن جذباتی مضامین و مقالات کا عام رواج ہو چکا تھا ان کی جگہ ٹھوس قومی اور ملکی مباحث کی طرح انقلاب ہی نے ڈالی - تحریک آزادی میں اور تحریک پاکستان کو پروان چڑھانے میں اس نے بیش قیمت خدمات انجام دیں -

انقلاب کو اکتوبر ۱۹۴۹ء میں حالات کی نامساعدت کی بنا پر بند کر دینا پڑا - اس کے بعد مہر صاحب ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہو گئے -

مہر صاحب کے قلم سے ان کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں نکلی ہیں، ان میں تاریخ و سوانح، مذہب و سیاست، تہذیب و تمدن، علوم و فنون وغیرہ موضوعات پر کتابیں ہیں - انھوں نے تحقیقی و تنقیدی کتابیں بھی لکھی ہیں - شرحیں بھی ہیں - انھوں نے کتابیں مرتب بھی کی ہیں اور بہت سی کتابیں ترجمہ کی ہیں - ان کے بعض ترجمے ایسے ہیں جن میں مصنف کی معلومات پر کلیتاً اعتماد نہیں کر لیا بلکہ ان پر حواشی و تعلیقات کا اور اضافوں کا سلسلہ بھی جاری رہا - بعض تراجم میں اضافوں سے کتاب کی نوعیت ہی بدل گئی ہے، اور ترجمے کے ساتھ تحقیق و ترتیب کا کارنامہ ظہور میں آگیا ہے - ڈاکٹر شفیق احمد کے علم میں مرحوم کی تہتر کتابیں آئی ہیں - ان کی ترتیب اس طرح ہے :

۱- تصنیفات	:	۱۳
۲ - تالیفات و ترتیبات	:	۱۲
۳ - شروح	:	۵
۴ - تراجم	:	۴۳ = ۷۳

ان کے علاوہ کلیات و دواوین اور تواریخ و سوانح کے بہت سے مجموعوں اور تصنیفات پر انھوں نے مقدمات تحریر فرمائے - بعض قدیم تراجم کی تہذیب و ترتیب اور انھیں وقت کے ادبی معیار کے مطابق بنانے کا کام مذکورۂ بالا کاموں سے بالکل الگ ہے -

تاریخ و سوانح، ادب و تنقید اور مختلف موضوعات پر ہزار ہا مقالات اس کے علاوہ ہیں۔ ان تمام مقالات کو دائرۂ شمار میں لانا آسان نہیں۔ انھوں نے اپنی اٹھائیس سالہ صحافتی زندگی میں ایک تخمینے کے مطابق متوسط سائز کی کتاب کے تقریباً چالیس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ یہ ایک محتاط اندازہ ہے، اس میں مبالغے کو قطعاً دخل نہیں۔ مہر صاحب ہی کا بیان ہے:

"اب تک جتنی خامہ فرسائی کی اس کے نتائج کی وسعت کا کوئی اندازہ ذہن میں موجود نہیں۔ میں نے اٹھائیس سال اخبار نویسی میں صرف کیے جو ذہنی اور بدنی قوتوں کے بہترین سال تھے اور وہ بھی روزنامہ نویسی میں۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے صرف افتتاحی مقالات کا سرسری حساب کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ متوسط سائز کی ہر جلد پانچ سو صفحے کی رکھی جائے تو میرے لکھے ہوئے مقالات افتتاحیہ کم و بیش اسی ۸۰ جلدوں میں سمائیں گے۔"

بعض شخصیات پر انھیں لکھتے ہوئے قرن گزر چکے ہیں مثلاً اقبال اور غالب پر ان کے سیکڑوں مقالات ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر تقریباً تیس مقالات میرے علم میں آئے تھے جو انھوں نے ملک اور بیرونِ ملک کے جرائد کے لیے لکھے تھے۔ غالب پر وہ ۱۹۲۴-۲۵ء سے برابر لکھ رہے تھے۔ علامہ اقبال پر انھوں نے پچاسوں مقالے لکھے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر ان کے قلم سے صرف مقالات کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ پھر یہ تو صرف ان شخصیات پر مقالات ہیں، ان پر مستقل تصانیف اور ان کے کلام، مکاتیب، مقالات کی ترتیب کا کام جو ہزار ہا صفحات پر پھیلا ہوا ہے، وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ غالب، اقبال، ابوالکلام وغیرہ پر انھوں نے جو کام کیا ہے، وہ جس نوعیت اور معیار کا ہے اس پر الگ مقالات لکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب اور اقبال کے کلام کی شرحیں ان کا ادبی و تنقیدی کارنامہ ہے۔

ان کے بعض مقالات تو مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مقالہ جو انھوں نے ۱۹۷۱ء کے اوائل میں مکمل کیا تھا اور ہنوز شائع نہیں ہوا ہے "جوش ملسیانی" پر ہے اور متوسط سائز کی کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں میں سمائے گا۔ اسی طرح غالب کی فارسی شاعری پر انھوں نے ایک مقالہ امریکہ سے ایک مطالبے پر لکھا تھا جو ان کے بقول فل اسکیپ سائز کے ٹائپ شدہ ۴۷ صفحوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یعنی متوسط سائز کی کتاب کے کم از کم سوا سو صفحے ہوں گے۔

متفرق مقالات کے سلسلے میں دائرۂ معارف اسلامیہ میں مقالات نویسی کا ذکر کر دینا چاہیے۔ اس میں ان کے، مختلف شخصیات، مقامات، اور تاریخی موضوعات پر ستّرہ مقالات نہایت مفصل شامل ہیں۔ ان کے پایۂ تحقیق اور معیار علمی کا اندازہ دائرۂ معارف اسلامیہ کے معیار سے لگایا جا سکتا ہے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم کے انتقال کے بعد اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی آمد سے قبل دائرۂ معارف کے تمام مقالات کی تصحیح و نظر ثانی کا کام انھی کے ذمے تھا۔ یہ کام جس ذمہ داری کا تھا اس کا اندازہ شناس بھی ہر شخص نہیں ہو سکتا۔

ان کی بعض تصانیف اردو ادب میں اپنی نوعیت اور معیار کے لحاظ سے کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔ مثلاً "غالب" اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں خود غالب کی تحریرات سے ان کے حالات کا استنباط کیا گیا ہے۔ صرف پچھلے چند برس میں غالب پر پچاسوں کتابیں شائع ہو گئی ہیں، لیکن مہر صاحب کی کتاب "غالب" آج بھی بے نظیر و عدیم المثال ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کے بارے میں لکھا تھا:

> "آپ کی کتاب پڑھ کر نہایت جی خوش ہوا۔ یہ غالب کے حالاتِ زندگی پر پہلی کتاب ہے جو مولفانہ نظر و کاوش سے مرتب کی گئی ہے۔ آپ نے غالب کی تحریرات کا دقّتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا پھر اس کے نتائج اس سلیقے کے ساتھ ترتیب دے دیے کہ ایک پوری سوانح عمری وجود میں آگئی . . ."

سید احمد شہید اور ان کی تحریک پر مہر صاحب کی کتابیں اردو ادب کا نہایت بیش قیمت سرمایہ اور کمال تحقیق، حسن تصنیف و تالیف اور جامعیت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہیں ۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی تحریک استخلاص وطن، مجاہدین آزادی اور ان کے سرفروشانہ کارناموں پر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ادب اور تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔

وہ اپنی زندگی کی آخری شام تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ۔ زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے جو علمی کارنامہ انجام دیا وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مقالات سیرت کی ترتیب و تدوین ہے ۔ ان کے کمال تدوین نے ان مقالات کو ایک مستقل تصنیف کے سانچے میں ڈھال دیا تھا ۔ یہ کتاب "رسولؐ رحمت" کے نام سے ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے ۔ سیرت انبیاے کرام کے موضوع پر مولانا آزاد کے مقالات بھی ایک مجموعے میں مرتب کر دیے تھے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح میں ایک کتاب لکھ رہے تھے، اور مولانا آزادؒ کے والد مولانا خیر الدین کے حالات میں پانچواں باب زیر قلم تھا کہ وقت موعود آپہنچا اور مولانا مہر اپنے مالک حقیقی کے پاس روانہ ہو گئے ۔ یہ نامکمل کتاب رسالہ نقوش، لاہور کے شمارہ (۱۲۲) جنوری ۱۹۷۱ء میں چھپ گئی ہے ۔

مولانا آزاد پر مہر صاحب کی اہم تحریروں کا مجموعہ "مولانا ابوالکلام آزاد — ایک نادر روزگار شخصیت" مرتب ہو گیا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے ۔ اس کے علاوہ کئی کام ان کے پیش نظر تھے :

۱ ۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مقالات افتتاحیہ کو جو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۹ء تک اٹھائیس برس کی مدت کی تاریخ پر محیط تھے، اس طرح مرتب کر دینا چاہتے تھے کہ مسئلے کی کیفیت بیان کرنے کے بعد مختلف مقالوں کے ضروری حصے لے لیے جائیں تاکہ ہر مسئلہ اپنے پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ وقت و حالات کے

گردوپیش میں اپنی اہمیت کے ساتھ نمایاں ہو جائے۔

اس سلسلے میں انھوں نے کام شروع کر دیا تھا کئی اصحاب ان کی ہدایات کے مطابق مقالات کی نقل کر رہے تھے، اور کام بہت آگے بڑھ چکا تھا۔

۲۔ دوسرا کام ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مختلف اوقات میں انھوں نے علامہ اقبال مرحوم سے متعلق روزنامچہ لکھا تھا جس میں علامہ مرحوم کی زندگی، ان کے افکار و خیالات کے علاوہ سیکڑوں علمی، ادبی، تاریخی، تہذیبی اور دینی مسائل سمٹ آئے تھے۔ مہر صاحب اسے جلد سے جلد مرتب کر دینے کے لیے بہت بے چین تھے۔

مولانا کے انتقال کے بعد ان کے افادات میں سے علامہ اقبال پر ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کا ایک مجموعہ "اقبالیات" کے نام سے امجد سلیم علوی نے مرتب کر کے چھاپ دیا ہے۔ یہ مجموعہ اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

۳۔ ان کے پاس اخبار نویسی اور بعد کے دور کے مکاتیب کا ایک نہایت اہم ذخیرہ تھا جس میں ہندوستان کے اکثر مشاہیر کے خطوط شامل تھے جو زیادہ تر سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے تھے، مہر صاحب چاہتے تھے کہ انھیں بھی مرتب کر دیا جائے۔ یہ کام وہ اپنے چھوٹے صاحبزادے امجد سلیم کی مدد سے تھوڑا تھوڑا کر رہے تھے۔

شاعری:

مولانا غلام رسول مہر اردو اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مہر اُن کا تخلص تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا، کالج کے زمانے میں اور لاہور کے ادبی ماحول میں پروان چڑھا، کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو یہ زمانہ شاعری کے عروج کا تھا۔ صحافت کی مصروفیات اور تصنیف و تالیف کے انہماک نے انھیں شعر گوئی کی طرف پوری توجہ کا موقع نہیں دیا۔ آخری دَور میں

تو انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ مقدار کے لحاظ سے ان کا کلام زیادہ نہیں لیکن جتنا کچھ بھی ہے اس میں بہترین شاعرانہ محاسن موجود ہیں۔ شعر گوئی کے اعلیٰ ذوق کی کار فرمائی ان کی نظم و غزل کے ایک ایک شعر میں نمایاں ہے۔ غزل، نظم، رباعی وغیرہ اصناف سخن میں کلام یادگار ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کے شاعرانہ فکر سے بہت متاثر تھے۔ کلام میں مرحوم کا رنگ نمایاں ہے۔ یہاں بہ طور نمونۂ کلام چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

عشق ہے شیرِ خدا، عشق ہے سرِ علا
عشق ہے خیبر شکن، عشق ہے اقصیٰ خرام

عقل ہے لے کیفِ ذوق، عشق ہمہ جذب و شوق
عقل ہے بے مقتدیٰ، عشق جہاں کا امام

اِس کا نتیجہ بقا، اُس کا نتیجہ فنا
عشق کی مستی حلال، عقل کی مستی حرام

عقل کو خود اس کے تیر کر گئے غلطاں بخوں
عشق ہے قدرت کی ضرب، جس کی نہیں روک تھام

عقل لئیم و رجیم، عقل عذابِ الیم
عشق کریم الکرام، عشق امام الانام

عقل ہے عرفاں سے دور، منزلِ جاناں سے دور
عشق ہے یثرب خرام، عشق ہے یثرب مقام

ایک نظم "قلندروں کا طریق" کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ برگ و ساز کی پروا، نہ انتظارِ رفیق
زمانے بھر سے نرالا قلندروں کا طریق

اگر خدا پہ بھروسا ہے ہو یگانہ رواں
خدا سے بڑھ کے نہیں برگ و ساز کی توفیق

یہی ازل سے چلی آ رہی ہے وضعِ زماں
یہ بے دلوں سے ہے کجِ بازِ سر پھروں پہ شفیق

چند شعر فارسی کے بھی ملاحظہ ہوں :

غدیوِ عشقم و غمِ طرّۂ کلاہِ من است
فغانِ نیم شبی ، پرچمِ سپاہِ من است
مرا جہانِ دگر بخش کاین جہانِ کہن
ز فرق تا بقدم خستۂ نگاہ من است
ز مرگ و زیست چہ پرسش رود چو مے دانی
نہ این گناہ من است و نہ آن گناہ من است
کجاست ارض و سماے کہ آفریدۂ تست
ہر آنچہ مے نگرم معجز نگاہ من است

نمونۂ کلام کے یہ اشعار ڈاکٹر شفیق احمد کے تحقیقی مقالے "مولانا غلام رسول مہر —— حیات اور کارنامے" سے اخذ کیے گئے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر بڑے خوش ذوق، شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ گفتگو اور تحریر، دونوں میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا۔ جس طرح ان کی تحریر میں زور، روانی اور دل کشی تھی، اسی طرح ان کے لہجے میں اعتماد، گفتگو میں زور اور روانی ہوتی تھی۔ پورے اکیس برس گزر چکے ہیں لیکن ان کی آواز کی شیرینی آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مولانا مہر ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ فضائلِ اخلاق اور محاسنِ سیرت کا دلاویز مجموعہ اور بے نیازی و خودداری میں مثال تھے۔ جنرل ایوب خاں کے عہد میں انھیں علمی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ حسن کارکردگی سے سرفراز کرنے کی تجویز تھی لیکن انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

مولانا مہر کتاب و سنت سے تمسک کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ سیرت نبوی

سے عشق تھا۔ متقی پرہیز گار، عبادت گذار، زاہد شب زندہ دار اور فضائل اعمال کا ایک حسین مجموعہ تھے۔ روز و شب کے معمولات مقرر تھے اور ان میں ہفتوں اور مہینوں تو کیا برسوں میں فرق نہ پڑتا تھا۔

۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال سے ملک ایک نامور مورخ، عظیم صحافی، صاحب طرز انشا پرداز، صاحب فکر نقاد، اور اردو فارسی کے ایک شاعر سے محروم ہوگیا۔ قدیم و جدید علوم پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ خصوصاً تاریخ اسلام اور تاریخ اسلامیانِ ہند پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، سیاسی، ثقافتی تحریکات، جدوجہد آزادی کے نشیب و فراز، ان کے جلی و خفی گوشوں اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر ان کے عبور و تبحر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کے۔ اہم واقعوں اور فیصلوں کے واقعی پس منظر، سیاسی جماعتوں کے حقیقی کردار اور رہنماؤں کی ذاتی اور سیاسی سیرت کے سرائر و خفایا سے واقف تھے۔ وہ ایک نادرِ روزگار شخصیت تھے۔ ان کی وفات سے علم و ادب کی دنیا میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کے پُر ہونے کی ایک مدت تک امید نہیں کی جاسکتی۔ وہ قدیم اخلاق و تہذیب اور وضع داری کا مجسمہ تھے۔

اس پایے کی شخصیتیں سیکڑوں برس کی سیر و گردش کے بعد مطلع عالم پر نمودار ہوتی ہیں، اور ایک عالم کو منور کرنے کے بعد جب ان کا آفتاب علم و فضل نگاہوں سے روپوش ہو جاتا ہے تو پھر صدیوں تک اس پایے کی کسی اور شخصیت کے نظارۂ جمال کے لیے دنیا کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔

انتقال کے بعد:

مولانا مہر کے انتقال کے بعد ان کے افادات کی تالیف کے سلسلے میں چند کام انجام پائے اور شائع ہوئے ہیں؛

۱۔ افادات مہر: ڈاکٹر شبیر بہادر خان پنی کے نام مولانا کے ۷۷ خطوط کا مجموعہ۔ ڈاکٹر پنی (ف ۹ر نومبر ۱۹۸۷ئہ) نے انھیں خود مرتب کیا اور ضروری حواشی تحریر فرمائے۔

۲۔ خطوط: سید انیس شاہ جیلانی کے نام مولانا کے ۲۲۴ خطوط کا مجموعہ۔ جیلانی صاحب نے اسے خود مرتب کیا ہے اور حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

۳۔ سفر نامہ حجاز: ۱۹۳۰ء میں مولانا مہر مرحوم نے سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل فیصل کی دعوت پر حجاز کا سفر کیا تھا اور سفر کے حالات اسی زمانے میں انقلاب میں چھاپ دیے تھے۔ خاکسار ابوسلمان نے انھیں مرتب کر دیا ہے۔

مولانا مہر کے افادات و نگارشات کی تالیف و ترتیب کے سلسلے میں مرحوم کے صاحبزادگان کے پیش نظر کئی کام ہیں جو اِنْ شَاءَ اللہ اپنے وقت پر انجام پائیں گے۔ اس سلسلے میں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے امجد سلیم خاص طور پر دل چسپی لے رہے ہیں۔

مولانا مہر پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔ محمد یوسف نے ایم۔ اے کے لیے تحقیقی مقالہ تو مولانا کی زندگی میں لکھا تھا۔ مولانا کے انتقال کے بعد ڈاکٹر شفیق احمد نے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب پیر علی محمد شاہ راشدی مرحوم کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ جن کا اظہار راشدی مرحوم نے مولانا کی وفات کے بعد روزنامہ جنگ، کراچی کے ایک سلسلۂ مضمون میں کیا تھا۔

باب اوّل :

مولانا مہر مرحوم اور تاریخ پاکستان کی ایک اہم کڑی

اچھا ہوا !

اس سے پہلے کہ آشیانہ جلتا، بُلبل اڑ گیا !

رہ جاتا بھی تو کیا کرتا ؟

بے بسی کے آنسو بہاتا !

آہ و فغاں کرتا !

مگر اس کی فریاد سنتا کون ؟

اس کی بولی سمجھتا کون ؟

کس کو ہوتا یہ احساس کہ جو آشیانہ جلا ہے، اس کے لیے تنکے جمع کرنے ہیں۔ اس مشتِ استخواں نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ صرف کیا ہوا تھا ؟ اس کی فکر میں کتنی راتیں اس نے جاگ کر گزاری ہیں ! اور سحر کو اُٹھ اُٹھ کر اس کے لیے خدا کے حضور آہ و زاری کی ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان واقع ہوا، اِس سے چند روز پہلے مولانا غلام رسول مہر مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میرے لیے تو ایک نہیں ـــــ دو حادثے بجلی بن کر دل پر گرے۔ میں ایک کا نہیں دو کا ماتم گسار ہوں۔

شکوہ سنجِ اہل وطن :

یقین ہے کہ جنت پہنچ کر اب وہ اپنے پیش رووں کے سامنے روداد چمن بیان کر رہے ہوں گے۔ علامہ اقبال ؒ۔ قائد اعظم رح۔ قائدِ ملت ؒ۔ خواجہ ناظم الدین رح۔ مولوی فضل الحق رح۔ شہید سہروردی رح۔ بہادر یار جنگ ؒ۔ نواب اسمٰعیل خاں رح۔ سید عبدالرؤف ؒ۔

سید عبدالعزیز بہاری رح۔ سیٹھ عبداللہ ہارون رح۔ مولوی تمیز الدین خاں رح۔ سردار عبدالرب نشتر رح۔ مولانا اکرم خاں رح۔ اسمٰعیل چندریگر رح۔ سردار اورنگ زیب رح۔ سکندر حیات خاں رح سب موجود ہوں گے۔ علاوہ ان کے وہ لاکھوں بے نام ونشان اور بے گوروکفن شہدا بھی شریک اجلاس ہوں گے جنھوں نے پاکستان کے عشق میں اپنی جانیں قربان کی تھیں۔

یہ نو وارد، سرتاپا پیکر غم، کاغذی پیرہن پہنے وہ سب کچھ ان کو سنا رہا ہوگا جس کے اظہار کی دنیا والوں نے اس کو اجازت نہیں دی۔ تیرہ سال کی زبان بندی کے بعد پہلی بار اس کی زبان کھلی ہوگی۔ اور وہ زبان بھی کس کی؟ غلام رسول مہر کی!

المیۂ پاکستان کے جملہ اداکاروں کے کرتوتوں پر سے پردہ ہٹ رہا ہوگا۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال پیش ہو رہا ہوگا جس نے جو کچھ کیا ظاہر ہو رہا ہوگا۔

غرض سننے کی چیز ہوگی یہ دردبھری کہانی اور مہر کی زبانی ـــ!

پاکستان کا پہلا ترجمان:

مہر مرحوم کی پاکستان سے خاص نسبت اور اس وجہ سے خصوصی الفت تھی۔

پاکستان کا خواب سب سے پہلے جس نے بھی دیکھا ہو اس کی تعبیر ایک قابل عمل سیاسی فارمولے کی صورت میں مہر کے دماغ نے ہی فراہم کی۔ جس طرح کہ آگے بیان ہوگا۔ انھوں نے یہ ثابت کرکے دکھایا کہ پاکستان بن سکتا ہے، پاکستان بننا چاہیے، اور پاکستان بنانے کے لیے نقشہ کیا پیش نظر رہنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے دلائل سے مسلم لیگی قیادت کو پاکستان کے اصول اور افادیت کا قائل نہ کرتے تو مسلم لیگ ہرگز یہ مطالبہ پیش نہ کرتی۔ نہ کرسکتی، اور بعد از عالمی جنگ ہندوستان کا نقشہ، اور مسلمانوں کی تقدیر کا عالم کچھ اور ہی ہوتا۔ اور پھر بھی قرارداد پاکستان (۱۹۴۰ء) سکندر حیات مرحوم اور پنجاب کی حکمراں پارٹی کے لیے کس طرح قابل قبول بنتی؟ اور اگر پنجاب اس وقت یہ قرارداد منظور نہ کرتا اور علیحدہ رہ جاتا تو بعد کی تحریک کس طرح موثر ثابت ہوتی؟ اور پنجاب یا سکندر حیات مرحوم کو کس نے اپنے استدلال سے متاثر ومطمئن کرکے اس راستے پر ڈالا؟

تحریک پاکستان کا پس منظر :

پہلے ۱۹۴۰ء سے قبل کی پوزیشن، یعنی تحریک پاکستان کا پس منظر، اپنے ذہن میں رکھ لیجیے :-

(۱) مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء میں کروٹ لی اور وہ مسلمانوں کی نمایندہ جماعت کی حیثیت سے ابھرنے لگی۔

(۲) ۱۹۳۷ء میں اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ اِن انتخابات میں مسلم لیگ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ انتخابات کے نتیجہ کے طور پر ہندو اکثریت والے صوبوں میں کانگریس وزارتیں وجود میں آئیں۔ جنھوں نے مسلم اقلیت سے انتہائی بدسلوکی روا رکھی۔ خود مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں بھی آگے پیچھے غیر لیگی وزارتیں بنیں۔

سرحد میں کانگریس کی۔ پنجاب میں یونینسٹ کی۔
سندھ میں خان بہادر اللہ بخش کی اور بنگال میں پرو جا پارٹی کی۔

(۳) ان حالات کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں احساس محرومی پیدا ہوا، اور وہ اپنے تحفظ کے لیے مسلم لیگ کا سہارا ڈھونڈنے لگے اور مسلم لیگ کی مقبولیت اور اثر میں اضافہ ہونے لگا۔

(۴) مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتے ہی ایک طرف تو قاید اعظمؒ تیز اور تند لہجے میں کانگریس کی کارگزاریوں پر نکتہ چینی کرنے لگے، اور دوسری طرف کانگریسی قیادت بھی اس بات کی ضرورت محسوس کرنے لگی کہ وہ معلوم کرے کہ مسلم لیگ آخر ان سے چاہتی کیا ہے —— یعنی ان کے مطالبے کیا ہیں؟

(۵) صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے بذریعہ خطوط، قاید اعظمؒ سے پوچھنا شروع کیا کہ ان کے خیال میں مسلمان کیا مانگتے ہیں، اور ان کے کیا مسائل ہیں جن کے بارے میں دونوں جماعتوں کی قیادت کے مابین گفتگو ہونی چاہیے۔

پنڈت جی کے خط کے الفاظ یہ ہیں :-

" سخت حیرت ہے کہ میرے بار بار عرض کرنے کے باوجود بھی

نہیں بتاتے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جن پر ہمیں بالمشافہ گفتگو
کرنا ہو گی۔" [1]

(۶) اس استفسار کے جواب میں قائدِ اعظم نے اپنے خط مورخہ ۱۷ / مارچ ۱۹۳۸ء کے ساتھ پنڈت جی کو اخبارات کے دو تراشے بھیجے۔ ایک تراشہ اسٹیٹسمین مورخہ ۱۲ / فروری ۱۹۳۸ء کا (اس مضمون کا عنوان تھا: "مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے") اور دوسرا تراشہ لاہور کے ہفتہ وار نیو ٹائمز مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۸ء کا تھا۔ اور ساتھ ہی لکھا :-

"نیو ٹائمز کے اس مضمون میں جو یکم مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں" [2]

(۷) جو چیز خاص نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ کہ قائدِ اعظم کے ان خطوط میں اور اخبارات کے ان تراشوں میں کہیں بھی پاکستان یا تقسیم برصغیر کے بارے میں کوئی اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شروع ۱۹۳۸ء تک پاکستان یا تقسیم ملک کا خیال قائدِ اعظم کے اپنے ذہن میں موجود تھا۔ نیو ٹائمز کا یہ پورا مضمون ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب میں موجود ہے۔

(۸) البتہ مسلم لیگ سے باہر، اس زمانے کے لگ بھگ ڈاکٹر بٹالوی کے الفاظ میں :

"اخبارات میں چند تجاویز شائع ہو چکی تھیں جن کا نفسِ مضمون یہ تھا کہ برصغیر ہند میں ایک نہیں بلکہ تین چار مختلف فیڈریشن قائم کیے جائیں اور انھیں باہمی طور پر منسلک رکھنے کے لیے ایک ہلکی سی مرکزی حکومت کا وجود ہونا بھی چاہیے۔ ان میں سے ایک اسکیم حیدر آباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تھی، دوسری — علی گڑھ کے دو پروفیسروں یعنی ڈاکٹر

---

[1] ہماری قومی جدوجہد مؤلفہ ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی (ص ۱۰۵) — پنڈت نہرو کا خط بنام قائدِ اعظم رح مورخہ ۸ / مارچ ۱۹۳۸ء۔ [2] ہماری قومی جدوجہد ص ۱۰۷۔

ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے مرتب کی تھی۔ تیسری نواب سر شاہنواز خاں والی ممدوٹ نے شائع کی تھی اور چوتھی کے مصنف سر سکندر حیات خاں تھے۔۔۔۔"

مگر یہ سب اسکیمیں نیم پختہ، غیر مکمل، اور بعض افراد کے ذاتی جذبات و خیالاتِ منتشر کا مظہر تھیں اور اس قابل نہیں تھیں کہ وہ بطور ایک آئینی فارمولا پیش کی جا سکیں یا کسی کو قائل کر سکیں۔ پاکستان یا برصغیر کے بٹوارے کا تو ان میں کہیں ذکر تک نہیں۔ اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ مسلم لیگ یا قاید اعظم سے تو ان اسکیموں کا کوئی واسطہ ہی نہیں تھا اور نہ مسلم لیگ نے کبھی ان کو اس قدر اہمیت ہی دی کہ ان کو قابل غور ہی قرار دیتی۔

(۹) ادھر سندھ میں اسی زمانے میں (یعنی وسط ۱۹۳۸ میں) ہم لوگ صوبائی اسمبلی پالیٹکس میں کانگریس پارٹی کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور ہندو ممبروں کی زبردستیوں اور دخل اندازیوں سے نجات کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ ہمارے لیڈر حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم تھے وہ آل انڈیا پایے کے مسلمان رہنما تھے۔ مرکزی اسمبلی میں منتخب تو سندھ سے ہوئے تھے مگر ان کی ہمدردیاں برصغیر کے تمام مسلمانوں سے تھیں وہ حال ہی میں مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے۔

کراچی لیگ کانفرنس:

(۱۰) جولائی ۱۹۳۸ میں یہاں سندھ میں وزارت کے مسئلہ پر بحران پیدا ہو چکا تھا۔ وقت کے وزیر اعلیٰ خان بہادر اللہ بخش مرحوم تھے۔ جن کی حمایت کانگریس پارٹی کر رہی تھی۔ مسلمان چاہتے تھے کہ یہ وزارت ختم ہو اور اس کی جگہ پر مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو۔ چنانچہ سندھ میں مسلم لیگ تحریک کو پذیرائی دینے کے لیے سر عبداللہ ہارون مرحوم نے یہ انتظام کیا کہ کراچی میں اعلیٰ پیمانے پر صوبائی مسلم لیگ کانفرنس ہو۔ جس کی صدارت قاید اعظم فرمائیں۔ یہ کانفرنس ۱۲، ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ کو عید گاہ میدان کراچی میں منعقد ہوئی۔ صدارت قاید اعظم نے فرمائی۔ اس

میں شمولیت کے لیے مولوی فضل الحق مرحوم وزیر اعلیٰ بنگال، سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعلیٰ پنجاب، مولانا شوکت علی مرحوم اور مسلم انڈیا کے دوسرے چوٹی کے رہنما تشریف لے آئے۔ سر عبداللہ ہارون مجلس استقبالیہ کے چیئرمین تھے اور یہ خاکسار جنرل سیکریٹری"۔

(۱۱) یہ کانفرنس مسلمانوں کی تاریخ کی سب سے اہم کانفرنس ثابت ہوئی۔ وجہ یہ کہ اس کانفرنس سے تحریک پاکستان کی ابتدا ہوئی۔ بقول ڈاکٹر عاشق حسین صاحب:

"کراچی کانفرنس میں پاس شدہ قرار داد۔ گویا پیش خیمہ تھی اس قرار داد پاکستان کا جو آگے چل کر مارچ ۱۹۴۰ میں لاہور میں منظور ہوئی۔ تاہم اکتوبر ۱۹۳۸ء ہی میں لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست گویا ایک نئے موڑ اور ایک نئے رُخ پر آپہنچی تھی"۔ [۵]

مولانا مہر سے پہلا تعارف:

اب اس کانفرنس سے مولانا غلام رسول مہر کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں تک ان سے میرے تعارف کا تعلق تھا۔

کانفرنس بلانے کا کام ستمبر سے شروع ہوا۔ اب پورے طور سے یاد نہیں رہا۔ مگر آخر ستمبر یا شروع اکتوبر میں ایک روز سر عبداللہ ہارون مرحوم نے مجھے اپنی کوٹھی پر بلا لیا۔ میں ان کے یہاں حاضر ہوا تو وہاں ایک اور صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ قد آور، نہایت وجیہہ، رنگ گورا، جسم متناسب، لباس شیروانی، شلوار اور نرم ترکی ٹوپی —

سر صاحب نے تعارف کرایا:

"یہ ہیں مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب لاہور۔ انھوں نے اور ان کے ساتھی مولانا عبدالمجید سالک نے مل کر موجودہ دور کے مسلمانوں کی تاریخ بنائی ہے۔ ہندوستان اور خاص طور سے مسلمانوں کی سیاست کے یہ دور حاضر کے سب سے بڑے ایکسپرٹ ہیں۔ ان کو میں نے یہاں آنے کی تکلیف اس مقصد

---

[۵] ہماری قومی جدوجہد ص ۱۵۸۔

سپے دی ہے کہ ہماری کانفرنس کے پیش نظر، ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان سے مشورہ کیا جائے اور استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین کا خطبہ بھی انہی سے لکھوایا جائے اور ہوسکے تو چند ضروری قرار دادوں کے مسودات بھی۔"

مہر صاحب بڑی شفقت سے مجھ سے ملے اور اس کے بعد باتیں کرنے لگے ـــــ وزارت کی مخالفت کے باوجود کانفرنس کامیاب ہوگی یا نہیں ـــ؟ ہندو کس قدر رخنہ اندازی کرسکتے ہیں ــــ؟ ــــ جناح صاحبؒ کا استقبال ان کے شایانِ شان ہوگا یا نہیں ـــــ؟ سندھ سے متعلق کیا کیا مسائل درپیش ہیں ـ؟ خان بہادر اللہ بخش کو مسلم لیگ میں شامل ہونے میں کیا اعتراض ہے ـــــ؟ سیاسی لحاظ سے سندھ کے مسلمان لیڈر اس قدر کیوں پسماندہ ہیں؟ آل انڈیا مسائل کے بارے میں میری ذاتی سوچ کیا ہے ـــ؟ وغیرہ وغیرہ ـــ"

مَیں نے اور تو سب باتوں کے بارے میں اپنی رائے ان کی خدمت میں پیش کر دی ـــ سوائے آل انڈیا مسائل کے جن کے بارے میں میں بہت کم جانتا تھا۔

راشدی صاحب کے گھر قیام:

لنچ ٹیبل پر مَیں نے سر عبداللہ ہارون سے عرض کیا اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مَیں مہر صاحب کے قیام کے لیے اپنے یہاں انتظام کروں تاکہ ہم کانفرنس کے کام اور خطبہ استقبالیہ کے مندرجات کے بارے میں وقت بے وقت آپس میں مشورہ کرتے رہیں۔ سَر صاحب نے میری درخواست منظور فرمائی۔ میں لنچ کے بعد مہمان کو اپنے یہاں لے آیا۔

جامع حیثیات شخصیت:

روانہ ہونے سے قبل سر صاحب مرحوم نے ایک کونے میں لے جا کر مجھ سے کہا:

"بھائی! میں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت سے قابل آدمی دیکھے ہیں۔ مگر مہر صاحب کے مقابلے اور پایے کا کوئی آدمی مجھے نظر نہیں آیا۔ ان کی

رائے صائب ہوتی ہے۔ بے مثل اہل نظر اور صاحبِ فکر ہیں۔ سر فضل حسین، اور ڈاکٹر اقبال بھی ان کی ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس وقت بھی سکندر حیات خاں کے سب سے بڑے سیاسی مشیر یہی ہیں۔ یہ انھیں کے مشوروں اور رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ سکندر حیات خاں کی وزارت اس شان سے چل رہی ہے۔ تم بہت کچھ ان سے سیکھ سکتے ہو ـــــ مگر طالب علم بن کر، نہ کہ اپنی ہیبری جتا کر۔"

اس موقعے پر مولانا جتنے دن کراچی میں رہے میرے غریب خانہ ہی کو اپنے قیام سے مفتخر فرمایا۔ ایک ہفتے کے قریب ٹھہرے۔ مَیں صبح و شام ان کو عبداللہ ہارون کے یہاں لے جاتا تھا اور وہاں ہم تینوں بیٹھ کر سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ کبھی کبھی سَر صاحب ہمارے یہاں بھی آجاتے تھے۔ خاص طور سے جب کوئی نیا خیال ان کے ذہن میں آجاتا اور وہ اس کے بارے میں مولانا کی رائے معلوم کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتے تھے۔

تحریکِ پاکستان کا میرِ کارواں:

اِن ہی ملاقاتوں کے دوران میں پہلی بار مجھ پر منکشف ہوا کہ سر عبداللہ ہارون کو ان دنوں ایک خاص لگن لگ چکی تھی۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کی بالا دستی سے بچنے کا صرف ایک راستہ رہ گیا ہے وہ یہ کہ ملک کو تقسیم کرایا جائے اور مسلمانوں کے لیے پاکستان بنایا جائے۔

ان کے خیالات کا ماحصل یہ تھا:

"یہ ہوگا تو بہت بڑا پرابلم، مگر اس کے سوا مسلمانوں کا کام بھی نہیں بنے گا۔ مسلمانوں کے سامنے اس وقت کوئی دقیع نصب العین نہیں ہے۔ مسلم لیگ تحفظات اور نمایندوں اور سرکاری نوکروں کی تعداد میں اضافہ مانگتی رہتی ہے جناح صاحب کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ ہندوؤں سے تسلیم کرایا جائے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی تنہا نمایندہ جماعت ہے۔ مسلمان ان سطحی

باتوں میں اُلجھتے رہتے ہیں اور کسی گراں قدر، مستقل، اور فیصلہ کن نصب العین کی تجویز اور تعین کی اہمیت محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اس طرح سے طے نہیں ہوگا۔ اگر یہ تحریک چلے تو کسی بڑے مقصد کے لیے پروا نہیں اگر یہ مقصد فوری طور پر یا مستقبل قریب میں حاصل نہ ہو۔ کم از کم ایک دقیع نصب العین تو قوم کے سامنے آجانا چاہیے۔"

مولانا مہر کا نقطۂ نظر :

مولانا اپنی جگہ پر مدتوں سے مسئلے کے اِسی پہلو پر غور کرتے رہے تھے، اور اسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی ہندوؤں سے نہیں نبھے گی۔ انگریز جلد یا بدیر ضرور چلا جائے گا۔ ہندوستان میں جمہوریت قائم ہوگی جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی نمایندگی میں کمی بیشی یا سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی زیادہ بھرتی سے مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ نہیں ہو سکے گا جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا معاملہ ہوگا۔ لہذا یہی وقت ہے کہ مسلمان نئے اور انقلابی خطوط پر سوچیں۔

راہ کی مشکلات :

دو تین ملاقاتوں کے بعد سر عبداللہ ہارون اور مولانا مہر میں کامل اتفاق ہو گیا کہ حصول پاکستان کے لیے مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ البتہ چند رکاوٹیں اس کام میں ان کو نظر آرہی تھیں، جن کا ذکر وہ اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔ مثلاً :

(۱) قائد اعظمؒ کو کس طرح آمادہ کیا جائے کہ وہ یہ مطالبہ اپنالیں اور مسلم لیگ سے بھی منوالیں ؟ قائد اعظمؒ بڑے محتاط قسم کے رہنما تھے۔ وہ غیر دقیع اور جذباتی باتوں سے متاثر ہونے والے نہیں تھے۔

(۲) مسلم عوام میں اس نصب العین کو کس طرح مقبول بنایا جائے ؟

(۳) مسلم اکثریت کے مختلف صوبوں کی وزارتوں اور قیادتوں کو کس طرح اس کا قائل کیا جائے ؟

(۴) مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو تقسیم ملک پر کس طرح رضامند کیا جاتے

کیوں کہ بعداز تقسیم ان صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو مستقل طور پر ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر رہنا ہوگا۔ کیا یہ مسلم اقلیتیں اس قدر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گی ؟

(۵) مہم چلانے، اور اس نصب العین کو مقبول بنانے کے لیے ذرائع اور وسائل کہاں سے آئیں گے ؟ مسلمانوں کے پاس نہ تو پریس ہے نہ پیسہ۔ جہاں تک جماعتی پیمانے پر کوشش کا تعلق ہے تو اب تک تو خود مسلم لیگ بھی اس نصب العین سے ناآشنا ہے۔ اور پھر اس کے پاس بھی نہ پیسہ ہے نہ پریس۔

(۶) اس نصب العین کے بارے میں اب تک کوئی جامع اسکیم بھی مرتب نہیں ہوئی ہے۔ مگر ان دشواریوں کے باوجود فیصلہ یہ ہوا کہ "کچھ نہ کچھ ابتدا کر دی جائے" سر صاحب کے الفاظ میں : "LET US SET THE BALL ROLLING"

کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ :

مولانا مہر مرحوم نے میرے گھر میں بیٹھ کر سر عبداللہ ہارون کا خطبہ لکھا جو اب تاریخ پاکستان کی زینت ہے۔ اس خطبے کی تان اس پر آکر ٹوٹی کہ ہندوستان کے لیے کوئی آئینی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوگی جب تک اس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ HOM LAND قائم کرنے کا انتظام نہیں ہوگا۔ اُس زمانے میں ہٹلر بعض ملکوں کی جرمن اقلیتوں کے لیے HOME LAND کا مطالبہ کرتا رہتا تھا اور یہ لفظ ہماری سیاسی لغت میں وہاں سے آیا۔

تاریخی قرارداد :

کانفرنس کے لیے شیخ عبدالمجید سندھی صاحب نے ایک مفصّل قرارداد کا مسودہ تیار کیا ہوا تھا، جس میں ہندو اکثریت کی زبردستیوں اور مسلم اقلیت سے بے انصافیوں کی تفصیل تھی۔ جب یہ مسودہ مولانا مہر کو دکھایا گیا تو انھوں نے اس میں یہ اضافہ کر دیا تاکہ قرارداد اور سر صاحب کے خطبہ استقبالیہ کے مندرجات میں مطابقت رہے :

"سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے ہے کہ ہندوستان

کے وسیع براعظم میں مستقل امن وامان قائم رکھنے، یہاں بسنے والی دو قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے کلچر کو فروغ دینے انھیں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی اپنی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کرنے اور انھیں سیاسی طور پر حق خود ارادی عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں دو مختلف فیڈریشن قائم کیے جائیں جن میں سے ایک فیڈریشن مسلمانوں کا ہو اور دوسرا ہندوؤں کا۔

"چنانچہ یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ مرتب کرے جس کی رو سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے۔ مسلم اکثریت رکھنے والی ریاستیں، اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، متحدہ طور پر ایک فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ اس فیڈریشن کو اس امر کی آزادی ہونی چاہیے۔ کہ اگر ضروری محسوس ہو تو بیرونِ ہند کی کسی اسلامی مملکت کو بھی فیڈریشن میں شریک کر سکے۔ اس فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیتوں کو اسی قسم کے تحفظات عطا کیے جائیں گے جیسے ہندوستان کے غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہوں گے۔"

یہ قرارداد کانفرنس میں ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو منظور ہوئی یعنی قرارداد لاہور سے ڈیڑھ سال پہلے۔ ڈاکٹر عاشق حسین صاحب بٹالوی جو خود اس زمانے میں مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے کی گواہی میں اوپر پیش کر چکا ہوں جس میں انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ:

"یہ قرارداد گویا پیش خیمہ تھی اس قرارداد پاکستان کا جو آگے چل کر مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہوئی۔"

قابل غور نکتہ:

مزید یہ نکتہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس کانفرنس کے سامنے قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جو صدارتی خطبہ پڑھا اس میں اس نئے فکری رجحان یا اس انقلابی

نصب العین کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔ یعنی یہ ایک بالکل نئی چیز اس کانفرنس میں ہوئی جس پر اس سے پہلے مسلم لیگی سیاست کے سیاق و سباق میں کسی نے غور نہیں کیا تھا۔

مولانا مہر کا مشن :

مہر صاحب یہ دو دستاویزیں تیار کر کے اور ہمارے حوالے کر کے خود کانفرنس شروع ہونے سے پہلے واپس لاہور تشریف لے گئے۔ سر عبداللہ ہارون مرحوم نے ان کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر اس نئے تخیل کے بارے میں سر سکندر حیات خاں مرحوم سے تبادلۂ خیالات کریں اور ہو سکے تو ان کی حمایت حاصل کریں۔ بہر حال کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات سنتے ہی سر سکندر اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہو جائیں اور معاملہ بڑھے اس سے پہلے ہی اس کو ختم کروا ڈالیں۔

یہ مشن جو مولانا صاحب کے سپرد کیا گیا وہ اس لحاظ سے بے انتہا اہم تھا کہ سر سکندر حیات خاں کو اس دور کی سیاست میں کلیدی حیثیت حاصل تھی، وہ پنجاب جیسے صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے۔

انگریز پر ان کا بہت زیادہ اثر تھا، عالمی جنگ کے امکانات پیدا ہو چکے تھے اور انگریز کو پنجاب میں سے فوج بھرتی کرنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قاید اعظم خود بھی سر سکندر کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔

مولانا لاہور پہنچنے کے بعد اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور اس کا ثبوت جلد ہی مل گیا۔ سر سکندر مرحوم بہ نفس نفیس کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے۔ سر عبداللہ کا خطبہ سنا ــــ اور اُن کی موجودگی میں ہماری قرارداد منظور ہوئی، ان کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

یہ بہت بڑی بات تھی ــــ وزیر اعلیٰ پنجاب کی موجودگی میں ایسی انقلابی تحریک کا منظور ہونا !

(روزنامہ جنگ کراچی، ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء)

باب دوم:

مسلم ہند کی سیاست پر ایک نظر

پہلے باب میں، مَیں نے نظریۂ پاکستان کے سلسلۂ ارتقاء کی پہلی کڑی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ یہ کڑی سب سے اول ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو کراچی مسلم لیگ کانفرنس کے موقع پر وضع ہوئی، جب کہ بذریعہ قرارداد، جس کو مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی توجہ اس نکتہ کی طرف مبذول کرائی گئی کہ ملک تقسیم ہونا چاہیے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ فیڈریشن بننا چاہیے۔ یہ واقعہ قرارداد لاہور سے جو ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی تقریباً ڈیڑھ سال پہلے رونما ہوا تھا۔

کراچی کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی، اس کے بعد کیا کیا منازل پیش آئیں اور ان کو کس طرح طے کیا گیا، اور اس سلسلے میں مولانا مہر مرحوم نے کیا کیا خدمات انجام دیں ان کا ذکر کروں، اس سے پہلے مناسب ہے کہ اس وقت کے ملکی اور قومی ماحول اور عام حالات کا ایک مختصر مرقع پیش کر دوں تاکہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہو کہ یہ تخیل کس قسم کے ماحول کی پیداوار یا نتیجہ تھا۔

جس زمانے میں یہ تخیل ابھرا (یعنی ۱۹۳۸ء میں) سارے برصغیر کے مسلمان بالعموم متحد تھے۔ ان میں دو چیزوں کا شدید احساس پیدا ہو چکا تھا:

اوّل یہ کہ: برصغیر کے جملہ مسلمان ملتِ واحدہ ہیں۔

دوم یہ کہ: اگر انھوں نے اپنے لیے علیحدہ ملک نہ بنایا اور وہ ہندو اکثریت کے تحت محکوم بن کر رہ گئے تو ان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

اس احساس کو کانگرس کی صوبائی حکومتوں کی مسلم آزار پالیسیوں سے بے انتہا تقویت پہنچی تھی اور مسلمان اب ہندو راج کے معنی بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ ہماری خوش قسمتی اور ہندوؤں کی بدقسمتی سے کانگریسی حکومتوں نے بلاضرورت جلد بازی اور بے صبری کا مظاہرہ کر دیا۔ اگر وہ اس وقت تک مسلمانوں کو نہ چھیڑتیں جب تک کہ انگریز ہندوستان

سے نکل جاتا، اور سارے برصغیر پر ہندوؤں کا راج قائم ہو جاتا۔ تو غالباً مسلمان اطمینان سے سوئے رہتے اور وہ نہ ہندو سے خطرہ محسوس کرتے نہ حصولِ پاکستان کے لیے تحریک چلاتے۔ مگر ہوا یہ کہ صوبائی وزارتوں پر قبضہ کرتے ہی انھوں نے فوراً مسلمانوں کے خلاف ڈنڈا اٹھا لیا اور ان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں انھوں نے تنگ نظری کا ثبوت نہ دیا ہو۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے کافی موثر ثابت ہوئی اور وہ برصغیر کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بیک وقت جاگ اٹھے۔

اہلِ سندھ کی کانگریس سے ناراضگی :

ہم سندھ والے اگرچہ اپنے صوبے میں اکثریت میں تھے لیکن ہندوؤں اور اُن کی سرپرست کانگریس سے اس وجہ سے شاکی تھے :۔

(۱) اس نے ہمارے یہاں کی صوبائی وزارت کو بھی اپنے نرغے میں لے لیا تھا، اور اس کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ مفلوک الحال مسلم اکثریت کے لیے کوئی رفاہی، یا اصلاحی اقدام کر سکے۔

(۲) ہمارے شہر ہندوؤں کے شہر بن گئے تھے۔ اکثر ہندو کالونیوں میں شام کے بعد مسلمانوں کو گھومنے پھرنے کی بھی آزادی نہیں ہوتی تھی۔

(۳) قرض اور سود در سود کے نظام کے ذریعے سود خور ہندوؤں نے مسلمانوں کی ساٹھ فیصد زرعی اراضی پہلے سے کاملاً ہتھیالی تھی اور مزید بیس فیصد اراضی ان کے پاس گروی ہو چکی تھی۔

(۴) تعلیمی ادارے تقریباً سب کے سب ان کے قبضے میں تھے۔ بڑی مشکل سے مسلمان حیدرآباد جیسے شہر میں اپنا علیحدہ صرف ایک ہائی اسکول (نور محمد ہائی اسکول) کھول سکے تھے۔

(۵) سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا تناسب ستر سے اسّی فیصد تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے تھے، کوئی اُن کا

پرُسان حال نہیں تھا۔

(٦) ہندوؤں کی دھونس کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر وقت بلوہ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے کیوں کہ بلوہ ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو جھوٹے فوجداری مقدموں میں پھنسا کر ان کو کنگال بنانے کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا تھا۔ عدالتوں میں عام طور پر ہندو جج اور مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ پولیس افسروں میں پچاس فیصد سے اوپر ہندو تھے۔ جتنے بھی بڑے بڑے وکیل تھے وہ سب ہندو تھے۔

(۷) سوائے ایک روزنامہ "الوحید" کے باقی سارا پریس ہندوؤں کے قبضے میں تھا۔

(۸) عربی سندھی رسم الخط کو خارج البلد کروانے کے لیے تحریک شروع کر دی گئی تھی۔ اور بڑے زور سے یہ کوشش ہوتی رہی کہ سندھی دفتری تحریر اور لٹریچر میں سے فارسی الفاظ نکلوا کر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جائیں۔

(۹) مجموعی مقصد اس پالیسی کا یہ تھا کہ سندھ میں سے مسلمانوں کے تشخص کو مٹا دیا جائے۔

سیاسی تاریخ کے چند اہم ماخذ :

جس دور کا یہ ذکر ہے اِس دور کے حالات کا مزید مطالعہ مرقومۂ ذیل سیاسی اور تاریخی مواد اور دستاویزات کی مدد سے اب بھی کیا جا سکتا ہے :

(۱) سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے میموریل اور قراردادیں ۱۹۰٦ سے ۱۹۳۰ء تک۔

(۲) "الوحید" "مسلم ایڈووکیٹ" اور دوسرے مسلم اخبارات کے فائل ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۷ء تک کے۔

(۳) ہندو اخبارات کے فائل مثلاً سندھ آبزرور، ہندو سنسار، ہماچار، سندھی، نیو ٹائمز، ماتر بھومی، سندھ واسی، سنسار چکر، فرنٹیئر گزٹ، لاڑکانہ گزٹ، میرپور خاص گزٹ وغیرہ۔

(۴) بمبئی کونسل کی DEBATES (مطبوعہ کارگزاریاں) سندھ کے نمایندوں کی

تقریریں اور ان کی پیش کردہ تجاویز ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۶ تک۔

(۵) سندھ اسمبلی کی مطبوعہ کارگزاریاں ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۶ تک کی خصوصاً قانون انتقال اراضی اور قرضوں سے نجات دلوانے کے لیے قانون پر مباحث۔

(۶) بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بارے میں جملہ سیاسی لٹریچر، کتابیں، پمفلٹ، قراردادیں، برطانیہ کی جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمایندوں کے بیانات اور سوال وجواب اور ان مختلف سرکاری کمیٹیوں کی رپورٹیں جو سندھ کی علیحدگی کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً مقرر ہوتی رہیں۔ خصوصاً ہندو اور مسلمان نمایندوں کے بیانات ان کمیٹیوں کے سامنے۔

(۷) ۱۹۲۷ء کے فسادات لاڑکانہ کے بارے میں سیشن جج نارمن کا فتویٰ۔

(۸) سکھر و روہڑی ڈویژن کے فسادات (۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ تک) سے متعلق مختلف عدالتوں کے فیصلے، اخبارات کے مقالات، اور لیڈروں کے بیانات۔

(۹) مسجد منزل گاہ سکھر سے متعلق ساری روداد۔

(۱۰) (مطبوعہ) بمبئی سول لسٹ ۱۹۳۶ تک کی۔ اور سندھ سول لسٹ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۷ تک کی۔ ان سے سرکاری ملازمتوں میں سندھ کے مسلمانوں کے تناسب کا پتا چلے گا۔

(۱۱) مسائل سندھ پر ان حضرات کے بیانات :-

آنریبل غلام محمد، بھرگڑی مرحوم، آنریبل سید اللہ ڈینو شاہ مرحوم۔ سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون مرحوم، بابا میر محمد بلوچ مرحوم، سر شاہنواز خان بھٹو مرحوم، جناب شیخ عبدالمجید سندھی، جناب جی ایم سید، خان بہادر ولی محمد حسن علی مرحوم اور ہندو لیڈروں میں سے جناب جے رام داس، دولت رام (بمبئی کونسل)، لال چند نول رائے (مرکزی اسمبلی) مسٹر بھوج سنگھ پہلا جانی (بمبئی کونسل) پروفیسر گھنشیام (سندھ اسمبلی) اور پروفیسر چھبلانی کے ارشادات۔

(۱۲) سائمن کمیشن سے وابستہ بمبئی کمیٹی کی رپورٹ ـــ خصوصاً سندھ کے نمایندہ

سید میراں شاہ مرحوم کا اضافی نوٹ۔

(۱۳) کراچی مسلم لیگ کانفرنس ۱۹۳۸ کی کارگزاری اور قراردادیں، اور سر عبداللہ ہارون کا خطبۂ استقبالیہ۔

(۱۴) قائداعظمؒ کا بیان سندھ وزارت کے بارے میں کراچی لیگ کانفرنس کے موقع پر۔

(۱۵) جی ایم سید صاحب کی تقریر جو انھوں نے اس وقت کی جب انھوں نے ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی کے سامنے یہ قرارداد پیش کی کہ پاکستان بننا چاہیے، اور صوبہ سندھ پاکستان کے حق میں ہے۔

(۱۶) خان بہادر (محمد ایوب) کھوڑو کی کتاب "A STORY OF SUFFERING OF SIND" مطبوعہ ۱۹۳۰ء اور ان کا بیان جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی لندن کے سامنے (۱۹۳۲)۔

یہ سب مواد خام سندھ کی تاریخ سے متعلق موجود ہے، اور اس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ سندھ کے مسلمانوں پر اس دَور میں کیا بیتی، وہ کیوں اپنا علیحدہ صوبہ بنانا چاہتے تھے، اور بعد میں انھوں نے کیوں پاکستان تحریک کو اپنایا، اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے اس قدر مستعدی دکھائی۔

غیر متعصب ہندو:

ایک بات میں ضمناً اب بھی صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ سندھ کے سب ہندو یکساں متعصب، تنگ دل — یا مسلم آزار نہیں تھے۔ کئی ایک ہندو غیر متعصب، منصف مزاج، اور اسلامی ثقافت اور تصوف کے قائل بھی تھے مگر یہ اکثر پرانے دَور کے لوگ تھے۔ جن کی نئے دَور میں نہیں چلتی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے بعد کی ہندو پود کے خیالات اور طریقہ کار بالکل مختلف تھا۔ یہ نئے لوگ بالعموم احساس برتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اِن میں تعصب پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا فائدہ اٹھائیں اور ان کو اپنا محکوم بنا کر رکھیں۔ یہ صریحاً کم عقلی اور غیر مآل اندیشی کا کام تھا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ۱۹۱۱ء کے بعد ہندوؤں کی طرف سے جو لوگ سیاسی افق پر ابھرے وہ سندھ کی قدیمی روایات رواداری اور صلح و آشتی کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں پر دھونس

ہمارے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔

ردِعمل :

اور یہی وجہ تھی کہ بطور ردِعمل مسلمانوں نے ان کی حرکتوں سے تنگ آکر اپنے لیے ایک علیحدہ راستہ نکال لیا۔ اور وہ راستہ تھا اولاً سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور بعد میں پاکستان کا۔ جن لوگوں کو اس دَور کی سندھی مسلم قیادت کے اس سیاسی رویے سے اختلاف ہو وہ براہ مہربانی اوپر بتائے ہوئے سارے لٹریچر کا مطالعہ فرمائیں، اور اس کے بعد فیصلہ دیں کہ جو کچھ ہم نے کیا وہ صحیح تھا یا غلط ؟

سندھ اور مسلم ہند :

رہا ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک دوسرے سے رابطے اور حسن سلوک کا سوال، تو اس کے بارے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ اس زمانے میں ان کے مابین کوئی تفریق یا ان کی آپس میں ایک دوسرے سے کوئی رقابت نہیں تھی۔ برصغیر کے سب مسلمان صرف مسلمان تھے۔ مسلمان کے سوا کچھ نہیں تھے۔ یہ احساس کسی کو نہیں تھا کہ اس کی پیدائش کس صوبے کی ہے۔ بالفاظ دیگر جن صوبائی عصبیتوں کا ہم بعد میں شکار ہوئے ان کا اس وقت نام و نشان نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ لوگ اپنے صوبے کے مسلمانوں سے زیادہ دوسرے صوبے کے مسلمانوں کا خیال رکھتے تھے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی محض صوبہ سندھ کے مسلمانوں کا مسئلہ تھا مگر اس کے بارے میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے سندھیوں کی مدد کی۔ سکھر کی مسجد منزل گاہ تحریک کے سلسلہ میں سندھ کے مسلمانوں نے سول نافرمانی کی تو ان کی مدد کے لیے پنجاب نے والنٹیر بھیجے۔ جنھوں نے سندھ میں آکر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

اہل سندھ کا اسلامی کیریکٹر :

بہار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو سندھ کے لیڈروں سر غلام حسین ہدایت اللہ مرحوم، میر غلام علی خان تالپور مرحوم اور خان بہادر محمد ایوب کھوڑو نے دہلی پہنچ کر قائداعظم سے درخواست کی کہ بہار کے مسلمان مہاجروں کا کچھ کوٹا سندھ کو بھی ملنا چاہیے کہ سندھ

کے مسلمان بھی اپنے ان بھائیوں کی مہمانداری اور خدمت کی سعادت حاصل کر سکیں۔ سی پی کے مسلمانوں پر کانگریس حکومت نے زیادتی کی، اور اس کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے چیلنج کے جواب میں مرکزی مسلم لیگ نے کمیٹی بنائی، تو اس کے سامنے مسلمانوں کا کیس پیش کرنے کے لیے مجھ جیسے ناچیز سندھی کو منتخب کیا گیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی کا صدر آل انڈیا خلافت کمیٹی اور صدر آل پارٹیز کانفرنس منتخب ہونا اسی جذبۂ اخوت اسلامی کا رہین منت تھا ورنہ ان مناصب کے لیے موزوں آدمی باقی ہندوستان میں بھی موجود تھے۔ اسی طرح مرحوم و مغفور رئیس غلام محمد خان بھرگڑی کا صدر آل انڈیا مسلم لیگ بننا اور آل انڈیا مسلم پالیٹکس میں اس قدر چمکنا اگر سیاست میں پذیرائی کی بنیاد صرف صوبائی رنگ و روپ پر ہوتی تو قائدِ اعظمؒ کو ہندوستان کے جملہ مسلمان کیوں اپنا قائد بناتے؟ آخر ان کی پیدائش بھی تو سندھ کی تھی، اور سر آغا خان مرحوم کی پیدائش کہاں کی تھی؟

مسلمانوں کا اندازِ فکر:

قصہ مختصر، جس دَور کا ذکر ہو رہا ہے، اس دَور کے مسلمانوں کا "اپروچ" ایک دوسرے کے بارے میں قطعاً مختلف ہوتا تھا۔ ان کی نظروں میں سارے برصغیر کا مسلمان ایک دوسرے کا بھائی تھا نہ کہ حریف یا مدمقابل۔ ایک پر مصیبت آتی تھی تو سب اس کی خاطر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ وہ وقت کچھ اور ہی تھا۔

عہدِ رفتہ کا ماتم گسار:

میری مشکل یہ ہے کہ میری ذہنی پرورش اس پرانے ماحول میں ہوئی اور اب آخر عمر میں میرے لیے دشوار ہے کہ میں اپنے ذہن کو کسی نئے سانچے میں ڈھال سکوں۔

ہمہ شہر پر ز خوباں من و رخیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

ہمارے اس دَور کے تقریباً سب ساتھی رخصت ہو گئے نہ کوئی ساتھ دینے والا رہا۔ نہ سننے والا نہ سمجھنے والا، "بازی بُرد ھوئی گوٹاں مُک گیاں۔"

پیش روانِ منزل :

بہرحال میں نے یہ تفصیلات اس لیے پیش کی ہیں تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ جس وقت نظریۂ پاکستان ابھرنے لگا، یا کراچی کانفرنس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک بنانے کے بارے میں تجویز منظور ہوئی یا مولانا مہر مرحوم اس اسٹیج پر تشریف لائے تو ملکی ماحول کیا تھا؟ وہ کیا حالات تھے جن کے دباؤ کے تحت ہم لوگ تقسیم ملک والے تخیل کی طرف لڑھکنے لگے، اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے سر عبداللہ ہارون مرحوم، شیخ عبدالمجید صاحب سندھی یا خود جناب جی ایم سید صاحب جیسی شخصیتوں کو تحریک پاکستان کے سلسلہ میں پیش پیش رہنے کی مجبوری محسوس ہوئی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک (تا وقتیکہ مرکزی مسلم لیگ نے اس نظریہ کو اپنا نہیں لیا تھا) ان بزرگوں کو تحریک کی امامت کرنی پڑی!

یہ پس منظر پیش کرنے کے بعد میں اب پھر اسی منزل کی طرف لوٹوں گا جہاں ہم نے پچھلے باب میں قرارداد کراچی اور اس کے سلسلہ میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے کردار اور خدمات کا قصہ چھوڑا تھا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سر عبداللہ ہارون کی ایماء پر اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کراچی مسلم لیگ کانفرنس نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ مرکزی مسلم لیگ کو ایسی آئینی اسکیم مرتب کرنی چاہیے، جس کے تحت برصغیر کو تقسیم کروایا جائے اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ فیڈریشن بنوایا جائے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس سے پہلے مسلم لیگ کو پاکستان بنانے کا یا ملک کو تقسیم کروانے کا کوئی خواب و خیال نہیں تھا۔

قائداعظم کا دورہ سندھ :

کراچی کانفرنس وسط اکتوبر میں ختم ہوئی اور اس کے بعد قائداعظمؒ نے سر عبداللہ ہارون کی معیت میں سندھ کا دورہ فرمایا۔ اس دورے کی خصوصیت یہ تھی کہ وقت کی وزارت کے ڈر سے سندھ کے اکثر بڑے لوگوں نے قائداعظم سے ملنے سے پہلو تہی کی اور ان کو سننے کے لیے جلسوں کے منعقد کرنے میں کوئی مدد نہیں کی۔ میں بھی ان کے ہم رکاب تھا۔ ہم جہاں گئے وہاں بڑے وڈیروں، اسمبلی ممبروں اور میونسپل نمائندوں

کو اس روز غائب پایا۔ جلسوں کا جتنا تھوڑا بہت انتظام ہوا۔ وہ ہمارے ذاتی دوستوں نے کیا۔ ان میں کچھ مقامی کانگریسی ہندو بھی تھے جو بے چارے اپنی گاندھی ٹوپیاں جیبوں میں چھپا کر جلسوں میں آئے تھے تاکہ حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہو اور قائداعظم کی نظروں میں ہماری ساکھ بحال رہ جائے۔

مشکلات راہ :

قائداعظم خیر سے بمبئی روانہ ہوئے تو سر عبداللہ ہارون مرحوم کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مذکورہ بالا قرارداد تو منظور ہو گئی مگر اب اس مقصد کو آگے کس طرح بڑھایا جائے؟ یعنی ملکی ماحول کو کس طرح نظریۂ پاکستان کے حق میں سازگار بنایا جائے۔ کئی ایک مشکلات ان کو نظر آ رہی تھیں مثلاً :

(۱) قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کو کس طرح تقسیم ملک کے اصول کا قائل کیا جائے ؟

(۲) جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں کے مسلمانوں کو کس طرح اس بات پر رضامند کیا جائے کہ جب ہندوستان کا بٹوارہ ہو اور مسلم اکثریت کے صوبے ان سے علیحدہ ہو جائیں تو یہ مستقل طور پر ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہنا گوارا کر لیں ؟

(۳) مسلم اکثریت کے صوبوں اور ان کی وزارتوں کو کس طرح آمادہ کیا جائے کہ وہ بھی اس اسکیم پر صاد کر لیں ؟ یہ صوبے تھے سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان۔ بنگال اور آسام۔ ان صوبوں میں اس وقت تک مسلم لیگ کی وزارتیں نہیں بنی تھیں۔ بلوچستان اصلاحات سے محروم تھا۔ سرحد پر کانگریسی وزارت مسلط تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا راج تھا۔ گو کہ رسمی طور پر سر سکندر حیات خان اب مسلم لیگ سے وفاداری کا دم بھرنے لگے تھے مگر ان کی پارٹی کے حقیقی روح رواں چودھری سر چھوٹو رام اور سکھ تھے۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ خود تو مسلم لیگ میں تھے مگر ان کی وزارت "پرو جا پارٹی" کی تھی۔ آسام کے وزیر اعلیٰ سر سعداللہ تھے۔ وہ یقیناً مسلم لیگ کے ہم درد تھے مگر ان کی پارٹی میں بھی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اب

سوال یہ تھا کہ اس مجموعۂ اضداد کو کن طریقوں سے گھیر گھار کر اس نئے انقلابی اور سنسنی خیز موقف کے قریب لایا جائے ؟

(۴) انگریز اب تک تو صرف کانگریس سے ہی کا پنسار بنتا تھا اور عملاً مسلم لیگ کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس آفت جاں کو کس طرح رام کیا جائے ؟ آخر بات تو ساری اسی کے ہاتھ میں تھی !

(۵) وہ اسکیم کہاں سے آئے جس کو دیکھ کر دنیا پاکستان کے جواز، افادیت، کارآمدگی اور FEASIBILITY کو تسلیم کر لے ؟

(۶) کانگریس، ہندو پریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعتیں لازماً پاکستان کا نام سن کر سیخ پا ہو جائیں گی ان سے زور آزمائی کے لیے کیا حکمت عملی ہو ؟ اپنے پاس تو نہ پیسہ تھا، نہ پریس اور نہ ورکر۔

عبداللہ ہارون کی حکمت عملی :

سر صاحب مرحوم نے پہلی ترکیب یہ کی کہ انھوں نے قرارداد کراچی کی آڑ لے کر خود نظریۂ پاکستان کو اپنے بیانات کے ذریعے اچھالنا شروع کر دیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کا نام سُن کر ہندو پریس زور سے اس نظریے کی مخالفت شروع کر دے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی توجہ خود بخود اس نظریے کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ ان دنوں کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی مضبوط پریس تو تھا نہیں ان کا سیاسی کاروبار اس طرح چلتا تھا کہ جس چیز کی مخالفت ہندو اخبارات کرتے تھے وہ اس چیز کو اپنے لیے مفید سمجھ کر اس کی تائید کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ عبداللہ ہارون نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس کام کے لیے انھوں نے جلد ہی مجھے لاہور بھی روانہ کیا تاکہ میں وہاں کچھ شور و شر بپا کر کے ہندو اور سکھ پریس کو پاکستان کی مخالفت پر اکساؤں۔ مقصد وہی تھا کہ ہندو پریس کی مخالفت دیکھ کر پنجاب کے مسلمان بھی نظریۂ پاکستان کے حق میں ہو جائیں۔ میرا یہ مشن کافی حد تک کامیاب ہوا، اور لاہور کے پریس میں نظریۂ پاکستان پر خوب بحثیں شروع ہو گئیں، ایک مضمون میں نے سَر

عبداللہ ہارون کی طرف سے بھی لاہور کے سب سے بڑے انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں چھپوا دیا۔ مضمون کی سرخی تھی "تلوار یا منطق" یعنی اگر منطقی دلائل سے کوئی نظریۂ پاکستان کا قائل نہیں ہوا تو مسلمان پاکستان کے حصول کے لیے تلوار سے کام لیں گے چوں کہ یہ ایک نئی اور انوکھی چیز کہی گئی تھی۔ اخبار نے اس کا خوب "DISPLAY" "ڈسپلے" کیا اور پنجاب اور شملہ کے سیاسی اور حکومتی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگ سمجھتے یہ تھے کہ یہ تحریک مسٹر جناحؒ کے اشارے پر شروع ہوئی ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ حرکتیں ہم جناحؒ صاحب کو بتائے بغیر کرنے لگے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ "پاکستان" کا چرچا ایک بار شروع ہو جائے، اور یہ نظریہ مسلمانوں میں "پاپولر" ہو کر اس قدر آگے بڑھے کہ مسلم لیگ بھی اس کو اپنانے پر مجبور ہو جائے۔

پروپیگنڈا کمیٹی کا قیام:

انہی دنوں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ ہوئی۔ عبداللہ ہارون مرحوم نے وہاں ایک قرارداد پیش کر دی کہ لیگ کی طرف سے ایک خاص کمیٹی مقرر ہو جو بیرون ملک اور اندرون ملک مسلم لیگ کے حق میں پروپیگنڈا کی مہم چلائے۔ یہ قرارداد منظور ہو گئی۔ سر عبداللہ ہارون کمیٹی کے چیئرمین اور رناکسار جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ سر عبداللہ ہارون پروپیگنڈا کا کام اپنے ہاتھوں میں اس مقصد سے لے رہے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کے چھاتے کے تحت رہ کر نظریہ پاکستان کے حق میں پروپیگنڈا کر سکیں، اور آہستہ آہستہ اندرونی پریشر کے ذریعہ ساری جماعت کو بھی منصوبۂ پاکستان سے "کمٹ" کروا ڈالیں۔ کمیٹی کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ اور لوگوں کو بھی اگر ضروری سمجھے تو بذریعہ CO-OPTION اپنے ساتھ شامل کر لے۔ سر عبداللہ ہارون نے اس سہولت کا فائدہ اٹھا کر مولانا مہر مرحوم کو کمیٹی میں لے لیا، اور پلاننگ اور آئندہ کے لیے حکمت عملی مرتب کرنے کا کام ان کے حوالے کر دیا۔ میرے سپرد یہ ڈیوٹی ہوئی کہ میں مولانا کی خدمت میں رہ کر ان کا ہاتھ بٹاؤں۔

کمیٹی کا پہلا اجلاس لاہور میں "ممدوٹ ولا" میں ہوا۔ نواب سر شاہنواز خان

مرحوم والی ممدوٹ پہلے سے کمیٹی کے ممبر تھے۔ مہمان داری کے فرائض انھوں نے ادا کیے۔ ممبر، غیر ممبر بہت لوگ شریک ہو گئے۔ مولانا محمد عرفان مرحوم سکریٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی بمبئی سے تشریف لے آئے۔ نواب صاحب مرحوم نے لنچ پر سر سکندر حیات خان مرحوم، ملک فیروز خان مرحوم (وہ چھٹی پر لندن سے آئے ہوئے تھے) اور پنجاب کے دوسرے لیڈروں کو بھی بلالیا۔ موضوع گفتگو "پاکستان" رہا، گو کہ بہت لوگ اس کو محض ہندوؤں کو چھیڑنے کے لیے ایک نیا مذاق سمجھتے رہے۔

مولانا مہر اور سر عبداللہ ہارون البتہ مطمئن تھے کہ ایک روز ان سب لوگوں کو جو اس وقت پاکستان کو ایک مذاق سمجھ رہے ہیں۔ اس نظریے کے سامنے سر جھکا دینا پڑے گا۔

کمیٹی کا پروگرام :

بہر حال درون خانہ ان دونوں بزرگوں نے اس موقعے پر آپس میں بیٹھ کر آیندہ کا پروگرام بنالیا۔ پروگرام یہ بنا کہ :

(۱)۔ نظریۂ پاکستان کے جواز میں اور اس کی FEASIBILITY کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے اب تک شائع شدہ جملہ اسکیموں اور تجویزوں کا جائزہ لے کر اور نیا مواد اکٹھا کر کے ایک جامع اسکیم مرتب کی جائے۔ اس شعبے کے سربراہ مولانا مہر مرحوم ہوں۔

(۲) بین الصوبائی وفود مرتب کیے جائیں جو مختلف صوبوں کا دورہ کر کے ظاہراً تو لیگ کا پروپیگنڈا کریں۔ مگر فی الحقیقت مسلمانوں کو نظریۂ پاکستان کی افادیت سے آشنا کریں۔ وفود کی ترتیب اس طرح ہو کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے نمایندے مسلم اقلیت والے صوبوں میں جا کر وہاں کے مسلمانوں سے جو کانگریس کے ستائے ہوئے ہیں۔ کہیں کہ ان کی تکالیف کا آخری مداوا صرف تقسیم برصغیر اور قیام پاکستان میں مضمر ہے۔ اسی طرح مسلم اقلیت والے صوبوں سے جوابی وفود یہاں آئیں جو آکر مسلم اکثریت والے صوبوں کے مسلمانوں کو بتائیں کہ ہندو اکثریت کے تحت

محکوم بن کر رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

ان وفود کو مرتب کرنے اور ان کے دوروں کا پروگرام بنانے کا کام میرے سپرد ہوا۔ مجھے لاہور میں رہ کر مولانا مہر کی رہنمائی میں یہ سب کچھ کرنا تھا۔ وفود کے اخراجات کے لیے سارا فنڈ سر صاحب مرحوم نے اپنے جیب سے فراہم کر دیا۔

اب تک کی سرگزشت کے ملاحظہ سے آپ نے دیکھ لیا کہ گو کہ دکھاوے کے لیے بہت لوگ منظر عام پر آئے اور آتے رہے۔ مگر حقیقی کام کا بوجھ مولانا مہر مرحوم کے کاندھوں پر ڈالا گیا۔ ان کو مطالبۂ پاکستان کو ایک صحیح، جائز اور قابل عمل سیاسی اور آئینی فارمولا ثابت کرنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان بھر میں رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کرنے کے لیے وفود کی تنظیم میں بھی مجھ ناتجربہ کار کی رہنمائی کرنی تھی۔

مولانا مہر ان کے علاوہ دیگر کئی اور ذمے داریوں سے بھی آگے چل کر بہت عمدگی سے عہدہ برآ ہوئے۔ اس کی تفصیل اس کے بعد پیش کروں گا۔ یہ تاریخ پاکستان کا ایک غیر تحریر شدہ باب ہے۔ مَیں مولانا مرحوم کی منتیں کرتا رہا کہ وہ خود اس کی کو پورا فرمادیں مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد بعض اسباب کی وجہ سے جن کا ذکر مَیں وقت پر کروں گا وہ دل برداشتہ ہوگئے تھے اور غالباً یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اپنی خدمات وہ خود جتائیں۔

(۲۱ر فروری ۱۹۷۲ء)

باب سوم :

تحریکِ پاکستان کا ایک اہم مرکز

میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ کراچی لیگ کانفرنس (۱۹۳۸) میں تقسیم ملک کے لیے قرارداد منظور ہوئی اس کے فوری بعد سر عبداللہ ہارون نے مجھ کو لاہور بھیجا مقصد یہ تھا کہ وہاں جا کر میں پاکستان کے بارے میں تھوڑا سا "شور و شر" پیا کروں تاکہ پنجاب کا ہندو پریس اس نظریے کی مخالفت کر کے اس کو مسلمانان پنجاب میں بطور ردعمل، مقبول بنوانے کا باعث بنے۔ اس زمانے میں ہندو پریس جس چیز کی مخالفت کرتا تھا وہ چیز خود بخود مسلمانوں میں مقبول ہو جاتی تھی۔

اس سفر لاہور کی روئیداد پیش کرنا اس لحاظ سے ضروری ہے کہ اس سے اندازہ ہوگا کہ جس شہر میں ڈیڑھ سال بعد قرارداد پاکستان منظور ہوئی، اور اب اس کی یاد میں ایک منار بھی تعمیر ہو چکا ہے، اس شہر کی فضا پاکستان یا مسلم لیگ کے بارے میں ان دنوں کیا تھی۔؟

۱۹۳۸، کا لاہور :

یہ نومبر ۱۹۳۸ کا قصہ ہے۔ لاہور میں میرا کوئی دوست یا آشنا نہیں تھا۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم سے حال ہی میں شناسائی ہو چکی تھی، جب وہ کراچی تشریف لائے تھے، مگر یہ تعلق اس قدر گہرا نہیں ہو پایا تھا کہ میں اپنا بوریا بستر لے کر ریلوے اسٹیشن سے سیدھا ان کے دولت خانے پر پہنچ جاؤں اور کا مہمان بنوں۔

اسٹیشن پر اترتے ہی میں ہوٹلوں کے دلالوں کے نرغے میں آگیا۔ ہر ایک اپنے ہوٹل کی تعریفیں کر کے مجھے وہاں کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ حتیٰ کہ میں جب ایک ہوٹل ایجنٹ کی معیت میں ٹانگے پر سوار ہو گیا تو دوسرے ہوٹلوں کے ایجنٹ گھوڑے کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے، اور اس کو آگے ہلنے نہ دیں۔ پہلے ان میں گالی گلوچ چلی پھر

نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ بالآخر ایک پولیس والے نے آکر معاملہ رفع دفع کرادیا اور ہمارا ٹانگہ بیڈن روڈ کی طرف روانہ ہوا۔ بیڈن روڈ پر اس زمانے میں ایک کرا ؤن ہوٹل ہوتا تھا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔

میں لاہور پہنچ تو گیا اور ہوٹل میں جگہ بھی مل گئی مگر اپنا کام کس طرح شروع کروں۔ اور کس کے ذریعے، یہ خود مجھے معلوم نہیں تھا۔ لاہور میں میرا کوئی واقف نہیں تھا، اور میں اس قدر چھوٹی عمر، اور چھوٹی حیثیت کا نوجوان تھا کہ میرا خیال تھا کہ اگر میں براہ راست پنجاب کے کسی لیڈر یا بڑے اخبار نویس سے ملاقات کرنے کی کوشش بھی کروں گا تو غالباً وہ مجھ سے مل کر اپنا وقت ضائع کرنا گوارا نہیں کرے گا۔

پنجاب کا عہد زرین :

پنجاب کی سیاست کا یہ عہد زرین تھا۔ سر فضل حسین مرحوم اور علامہ اقبال مرحوم تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر پھر بھی بہت سے بڑے پایے کے سیاست دان ابھی زندہ تھے جن کے نام اور تصاویر ہم لوگ اخبارات میں دیکھ کر مرعوب رہتے تھے۔ سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب، چودھری سر شہاب الدین، نواب احمد یار خان، دولتانہ، میاں عبدالحی، ملک برکت علی، چودھری چھوٹو رام، سر جوگندر سنگھ، سر منوہر لال، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سر عمر حیات خان ٹوانہ، سر فیروز خان نون، نواب مظفر خان، خضر حیات خان ٹوانہ، نواب احمد نواز خان، پیر مکھڈ، پیر تاج الدین، مولانا غلام مرشد، چمن لال بیرسٹر، غلام رسول خان، سر دول سنگھ کونسیر، راجہ غضنفر علی خان، سر سید مہر شاہ، نواب میجر عاشق حسین، نواب سر مرید حسین قریشی نواب مشتاق احمد گورمانی، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، سر ظفر اللہ خان، سر عبدالقادر، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، راجہ نریندر ناتھ، گوپی چند بھارگاوا، سر شاہنواز خان، نواب ممدوٹ میاں امیر الدین، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، لالہ بھیم سین سچر ــ ان میں سے ہر ایک تاریخ ساز، ہر ایک اعلیٰ درجے کا مدبر ہر ایک اپنی اپنی لائن میں یگانہ، اور آسمان سیاست و تدبر اور علم کے

یہ روشن ثوابت، و سیارے سب بیک وقت ارض پنجاب پر ضوفگن تھے۔

اللہ۔ اللہ۔ کیا شان تھی اس زمانہ میں پنجاب کی۔

یہ بعد کی بات ہے، جب سر سکندر حیات خان مرحوم اور مجھ میں مراسم بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئے تھے، مگر اس کا یہاں بیان کرنا شاید خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سندھ کے ایک وزیر:

ایک شام میں ان کی خدمت میں ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ یہ کوٹھی بعد میں پنجاب رینجرز کا ہیڈ کوارٹر بنی۔ میں اور مولانا مہر ان دنوں اکثر شام کو ان کے یہاں جاتے تھے۔ شام کو وہ دفتر کے کام سے فارغ ہو کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے تھے، جہاں ایک بہت ہی خوبصورت سبز رنگ کا قالین دیوار تا دیوار بچھا ہوا تھا، وہ حقہ پیتے رہتے تھے، اور اپنے چند بے تکلف دوستوں سے، جو اس وقت، اُن کے یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ گپیں ہانکتے رہتے تھے۔

جس روز کا یہ قصہ ہے اس روز صبح کو سندھ کے ایک، وزیر اُن سے مل کر گئے تھے۔ یہ وزیر صاحب اس وجہ سے بہت مشہور تھے کہ وہ ہر موقعے پر پارٹی بدل کر وزارت لے لیتے تھے، اور اس وقت تک تقریباً چار سال میں یہ صاحب چھ مرتبہ پارٹیاں بدل کر کرسیِ وزارت پر جمے رہے تھے۔

سر سکندر مجھے دروازے سے داخل ہوتے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں حیران ہو گیا کہ خلاف معمول وہ مجھے دیکھ کر آج کیوں ہنسنے لگے ہیں۔ عام طور سے یہ اعزاز صرف سردار دسوندا سنگھ کے لیے مختص ہوتا تھا۔ یہ ایک سادہ لوح سکھ تھے۔

جن کو بے ضرر سمجھ کر سر سکندر نے اپنی کابینہ میں لے لیا تھا۔ اور وہ اسمبلی میں خواہ نجی محفلوں میں اکثر نشانہ استہزا بنے رہتے تھے، اور خود بھی خوش ہوتے تھے کہ ان کی شخصیت کا اس قدر نوٹس لیا جاتا ہے۔ مولانا مہر اور ڈاکٹر عالم میرے ساتھ تھے۔ نواب میجر عاشق حسین مرحوم پہلے سے وہاں موجود تھے۔

میں نے سر سکندر سے پوچھا:

"حضور آج دسوندا سنگھ تشریف نہیں لائے ہیں۔ غالباً آج مجھے ان کی جگہ لینی پڑ رہی ہے۔"

سر صاحب زیادہ زور سے ہنسے اور فرمانے لگے :

"بیٹھو میں سبب بتاتا ہوں۔ آج آپ کے یہاں کا فلاں وزیر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا کہ اس نے پارٹی بدل کر دوبارہ وزارت حاصل کی تھی۔ مگر جب وہ مجھ سے ملا تو اس کے چہرہ اور گفتگو سے احساس شرمندگی کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے، گویا اس نے کوئی بے شرمی کا کام کیا ہی نہیں تھا ــــ اب تم مجھے بتاؤ کہ آپ کے صوبہ سندھ میں اس پایہ کے بے شرموں کی آبادی کا تناسب کیا ہوگا؟"

سر سکندر جیسے سنجیدہ، متین اور میٹھی طبیعت انسان کے منہ سے یہ کلمات سن کر میں تو جل گیا۔ میں نے عرض کیا:

"جناب والا۔ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد، پنجاب کی موجودہ شان آپ کی ذات کی وجہ سے ہے۔ آج آپ بے شک سندھ کے حال پر ہنسیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تا دیر آپ کا سایہ پنجاب کے سر پر قائم رکھے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے بعد پنجاب کا حال ہم سے بد رہا بدتر ہوگا۔ وہ ایک عمر رسیدہ مگر شادی کی خواہش مند بیوہ ہوگی جو ادھر اُدھر سے شوہر تلاش کرتی پھرے گی۔"

نواب میجر عاشق حسین مرحوم فرمانے لگے :

"راشدی صاحب : پنجاب کا ایسا حال کبھی نہیں ہوگا۔ یہ مردم خیز علاقہ ہے۔ یہاں بہت بڑے سیاست دان اس وقت موجود ہیں، اور اس کے بعد بھی پیدا ہوتے رہیں گے ــــ سب پختہ کار، سب با اصول۔"

میں نے کہا :

"ماشاء اللہ! جو لوگ اُس وقت زندہ ہوں گے وہ دیکھ لیں گے۔"

اس وقت تو بات آئی گئی۔ اس کے بعد قدرت کردگار کہ دو سال کے اندر سر سکندر حیات خان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور ابھی پانچ سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ لاہور کے بلوؤں کے دوران میں نواب عاشق حسین مرحوم خود بھی شہید ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔ بعد کی تاریخ سامنے ہے۔ سر سکندر حیات کے زمانے والا پنجاب پھر کسی نے نہیں دیکھا۔

نواب ممدوٹ مرحوم:

ایک اور قصہ بھی سن لیجیے جس سے ظاہر ہو گا کہ پنجاب میں لیڈری کرنے کے لیے اُس زمانے میں کس معیار کا انسانی مواد مطلوب رہتا تھا۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں ۱۹۴۰ء والے سالانہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ مقامی کارکنوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے مجھے بھی وہاں رہنا پڑا۔ سر شاہنواز خان ممدوٹ مرحوم استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ میں کچھ عرصہ ان کے مکان پر ان کے ساتھ رہا تھا۔ نواب صاحب مرحوم مجھ ناچیز پر بے انتہا کرم فرماتے تھے اور میری کسی درخواست یا سفارش کو رد نہیں کرتے تھے۔ انھی دنوں ایک روز میرے دوست محبوب قریشی مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں نواب صاحب سے سفارش کر کے نواب صاحب کے فرزند اکبر اور ولی عہد افتخار حسین خاں (مرحوم) کو اجلاس کے لیے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا سالار بنوا دوں۔ محبوب نے مجھے خبردار کر دیا کہ نواب صاحب آسانی سے یہ سفارش منظور نہیں کریں گے کیوں کہ وہ پہلے ایک مرتبہ انکار کر چکے ہیں۔ شام کے کھانے پر جب ہم اکٹھے ہوئے تو میں نے نواب صاحب سے کہا کہ نیشنل گارڈ کی سالاری کے لیے ان کا ولی عہد موزوں رہے گا۔

نواب صاحب نے پوچھا: "آپ کبھی اُن سے ملے بھی ہیں"؟

میں نے کہا، "نہیں، وہ لاہور آتے ہی نہیں ہیں۔ سارا وقت اپنی ریاست ممدوٹ میں رہتے ہیں۔

نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے پھر وہی موضوع چھیڑ نے

کی کوشش کی مگر نواب صاحب نے بات ٹال دی۔

نواب صاحب تقریباً ہر صبح چار بجے کے قریب مجھے اپنے کمرے میں بلا لیتے تھے اور نمازِ فجر تک ہم آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ شام والی گفتگو کے بعد اب اگلی صبح کو جو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے خود ہی پچھلی شام والا قصہ چھیڑا۔ مختصر یہ کہ جو کچھ انھوں نے اس وقت فرمایا وہ ان کے انتقال کے بعد سو فی صد صحیح ثابت ہوا۔ ان کی نظروں میں پنجاب کی سیاست کے لیے :ع

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند، کا معاملہ تھا۔

مستقبل میں نواب افتخار حسین خان مرحوم و مغفور پنجاب کے نامور وزیرِ اعلیٰ اور سندھ کے گورنر بھی بنے۔ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس زمانے میں نیشنل گارڈ کی سالاری کے لیے بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

چند نوجوانوں سے ملاقات :

بات سے بات نکلی اور میں اصل موضوع سے بہت دُور نکل گیا۔

ہوا یہ کہ کراؤن ہوٹل میں روم لے لینے کے بعد مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب میں کس طرح اپنا کام شروع کروں، میں اپنے کمرے سے نکل کر ہوٹل کے ڈائننگ روم میں گیا وہاں ایک ٹیبل پر تین چار نوجوان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہوٹل کے مینجر کو میں نے جاتے ہی بتا دیا تھا کہ میں کس کام سے آیا ہوا ہوں۔ مجھے ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر یہ منیجر صاحب خود بھی وہاں آ گئے اور میرا تعارف نوجوانوں کے اس گروپ سے کروا دیا۔

"یہ فلاں صاحب ہیں جن کا نام حال ہی کی کراچی مسلم لیگ کانفرنس کے سلسلے میں آپ اخبارات میں پڑھتے رہے ہیں ـــــ یہ اب لاہور اس لیے آئے ہوئے ہیں کہ یہاں بھی پاکستان اور مسلم لیگ کے بارے میں کچھ کام کریں۔"

لاہور کی سیاسی فضا :

اب میری باتیں اُن نوجوانوں سے ہوئیں۔ سب کو مخلص اور مستعد پایا۔ وہ قومی

کام کرنا چاہتے تھے مگر صوبہ کی سیاست پر بڑے لوگ چھائے ہوئے تھے جو نوجوانوں سے کوئی خدمت لینا چاہتے تھے نہ ان کو آگے بڑھنے دیتے تھے۔ ان کی زبانی سرسری طور پر معلوم ہوا کہ :

"فی الوقت مسجد شہید گنج (جو سکھوں کے قبضے میں تھی) کی واگزاری کے لیے تحریک چل رہی ہے۔ مخلوط یونینسٹ حکومت زیر قیادت سر سکندر مسئلے کو ٹالنا چاہتی ہے، اور مسلم عوام مُصر ہیں کہ مسجد کو اپنے قبضے میں لے کر ہی چھوڑیں گے۔ مسلم لیگ کی نہ کوئی تنظیم ہے نہ پنجاب کے بڑے لیڈروں کو اس سے دلچسپی۔ سال بھر ہوا کہ سر سکندر حیات خاں قائداعظم سے اس بارے میں ایک پیکٹ کر چکے ہیں، مگر اس پیکٹ سے پنجاب کی مسلم قیادت کا مقصد صرف یہ ہے کہ لیگ پر اس طرح سے اپنا تصرف جما کر اس کو پنجاب میں پروان چڑھنے سے روکے رکھیں۔ ویسے نام کی خاطر صوبائی مسلم لیگ بھی ہے، مگر اس کے صدر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سال بھر ہوا کہ رحلت فرما چکے ہیں۔ اب لیگ محض مسٹر غلام رسول خان جنرل سکریٹری کے دفتر تک محدود ہو چکی ہے۔ مسٹر غلام رسول خان سے کوئی شخص تعاون نہیں کر رہا ہے۔ وہ خود حکمران یونینسٹ پارٹی سے متنفر ہیں اور یونینسٹ پارٹی ان سے گریزاں۔ ملک برکت علی وکیل مسلم لیگ کے وفادار کارکن ہیں، اور وہی ایک اسمبلی ممبر ہیں جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں، مگر وہ بھی سارا وقت اسمبلی پالٹیکس میں اُلجھے رہتے ہیں۔ عام طور سے پنجاب کی سیاست پر وزیراعلٰے سر سکندر حیات خان حاوی ہیں۔ بقول شخصے ان کی منشا کے خلاف یہاں ایک پتہ نہیں ہل سکتا۔ اور وہ بھی چودھری چھوٹو رام کی منشا کے خلاف ایک قدم نہیں اٹھا سکتے (چودھری چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے ہندو گروپ کے لیڈر تھے اور بڑے زوردار سیاست دان تھے۔")

غیر مسلم تنظیمیں:

میرے ان نئے نوجوان دوستوں نے مزید یہ بتایا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو اور سکھ زیادہ منظم ہیں، اور ان کا پریس بھی بہت ہی مضبوط ہے۔ کانگریس، مہاسبھا، آریہ سماج سب ان کی فعال جماعتیں ہیں۔

لاہور کی صحافت:

اخبارات میں انگریزی "ٹریبون" ہندوستان بھر میں چوٹی کا روزنامہ سمجھا جاتا ہے مسلمانوں کا سخت دشمن، کانگریس کا مداح اور مہاسبھا کا معاون ہے۔ اردو اخبارات میں پرتاب، ملاپ، ویر بھارت، گورو گھنٹال بڑے پایے کے جرائد ہیں۔ ان کے پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔

زمیندار اور انقلاب:

جہاں تک مسلم پریس کا تعلق ہے صرف دو اردو روزنامے قابل ذکر ہیں حضرت مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" اور مولانا مہر اور مولانا سالک کا "انقلاب" زمیندار کی پالیسی مولانا ظفر علی خان صاحب کی ذاتی پسند اور ناپسند سے متاثر ہوتی رہتی ہے اور انقلاب یونینسٹ پارٹی کی طرف جھکا رہتا ہے۔ مسلم لیگ کا اپنا پارٹی روزنامہ کوئی نہیں۔ حالاں کہ پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ ہے۔

آغازِ کار:

یہ حالات کافی مایوس کن تھے۔ خصوصاً ایک باہر سے آئے ہوئے شخص کے نقطۂ نظر سے۔

میں نے ان نوجوانوں سے پوچھا کہ: "ان حالات کے باوجود اگر ہم کچھ کرنا چاہیں تو کیا کم از کم آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے؟"

انھوں نے کھلے دل سے تعاون پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسی وقت کام کا پروگرام بنالیا، ان کا مشورہ یہ تھا کہ اس وقت پنجاب میں دو شخصیتیں ہیں جن کی حیثیت کلیدی ہے۔ ایک نواب سر شاہنواز خان ممدوٹ، جو نام کی خاطر تو

صوبائی مسلم لیگ کے صدر بنائے گئے ہیں مگر وہ حکمراں یونینسٹ پارٹی کا حد سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کو کسی طرح سے اس ذہنی کیفیت سے نکالنا ہوگا۔

دوسری شخصیت مولانا غلام رسول مہر کی ہے۔ اگر ان کی حمایت حاصل کی جا سکے تو سر سکندر حیات خان اور ان کا سارا حکمران گروپ بلا توقف ہماری مدد پہ آمادہ ہو جائے گا۔ (ان نوجوانوں کو اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ مولانا مہر کراچی آ کر ہم سے یہ ساری باتیں طے کر آئے ہیں۔)

اس پروگرام کے تحت ہماری ابتدائی یورش کے دو "ٹارگیٹ" متعین ہوئے۔

نواب ممدوٹ

اور

مولانا مہر

ممدوٹ کو یونینسٹ پارٹی کے اثر سے باہر نکالنا تھا اور مہر کی وساطت سے ہم کو یونینسٹ پارٹی پہ اپنا اثر قائم کرنا تھا۔ عجیب ڈپلومیٹک منصوبہ بندی تھی۔

تحریک پاکستان کے اولین کارکن :

بہر حال مناسب ہے کہ اب اس منزل پر میں آپ کو اپنے ان نئے نوجوان ساتھیوں کے نام بھی بتا دوں جن کی مدد سے پنجاب میں تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالنے کی تجویز ہوئی۔ نام یہ ہیں :

(۱) محبوب احمد قریشی (مرحوم و مغفور) جنھوں نے اس کے بعد مسلم لیگ کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر اور جائنٹ سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔

(۲) سید خلیل الرحمٰن صاحب مزنگ والے جو بعد میں صوبائی جنرل سکریٹری اور تقسیم کے بعد نائب وزیر دفاع پاکستان، اور سفیر پاکستان بنے۔

(۳) جناب ظہیر الاسلام فاروقی (شاہ آباد کرنال کے) جو ہم سب کے حقیقی رہنما بنے اور ہمارے مشن کے روح رواں۔

ہمارا کام تھوڑا آگے بڑھا تو دو اور نوجوان بھی ہمارے رفیق بن گئے۔ یعنی :

(۱) جناب ظفر شیخ جو اب لاہور میں وکالت کر رہے ہیں۔ اور

(۲) لفٹنٹ شیخ جو بعد میں میجر جنرل خالد شیخ کہلائے۔ یہ دونوں صاحب محبوب مرحوم کے ذاتی دوست اور رفیق تھے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ جب ہمارے مشن کی نوعیت کا لوگوں کو کچھ پتا لگا تو چند اور حضرات بھی ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ مثلاً جناب پیر تاج الدین مرحوم بیرسٹر اور جناب خواجہ عبدالرحیم صاحب۔ موخرالذکر بزرگ نے اپنی سرکاری ملازمت کی پابندیوں کی قطعاً پروا نہ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہمیں اپنے مشوروں سے مستفید فرمایا۔ اور ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

لاہور میں ابتدائی کام :

مولانا مہر کا پتا میں نے ان دوستوں سے پوچھا۔ معلوم ہوا وہ لاہور کے مضافات میں مسلم ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ شام کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی سے واپس آنے کے بعد انھوں نے سر سکندر حیات خان اور ان کے چند ایک دوسرے رفیقوں سے بھی باتیں کر لی ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہیں گے کہ پنجاب میں براہِ راست مسلم لیگ کا اس قدر زور ہو کہ ان کی صوبائی وزارتی سیاست باہر والوں کے تابع فرمان بن جائے۔ البتہ اس حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ لیگ کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ مولانا کی نظر میں فی الوقت یہ سمجھوتا بھی غنیمت تھا۔ مستقبل کے متعلق انھوں نے یہ طریقہ تجویز کیا ہوا تھا کہ سکندر حیات خان کو ان کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر ہمیں چند ایک اقدام براہ راست اور اپنی ذمے داری پر کرنے چاہئیں تاکہ کچھ فضا پیدا ہو جائے۔

(۱) لاہور میں ورکروں کا ایک گروپ پیدا کیا جائے جو براہ راست ہم سے ذمہ داری محسوس کرے اور ہمارے تحت کام کرے۔

(۲) نواب ممدوٹ کو تیار کیا جائے کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کے

لیے زیادہ مستعدی سے کام کرکے اپنی سیاسی شخصیت بنائیں اور اس معاملے میں یونینسٹ پارٹی کی پروا نہ کریں۔

(۳) مسلم پریس میں تقسیم کے بارے میں بیانات دلوائے جائیں تاکہ پنجاب کے مسلمانوں میں اس سے دلچسپی پیدا ہو۔ ساتھ ہی ہندو پریس کو بھی اکسایا جائے کہ وہ اس کی مخالفت میں مضامین لکھے۔

(۴) تقسیم کے لیے جن لوگوں نے اب تک تجاویز مرتب کی ہیں ان سے رابطہ پیدا کیا جائے۔ تاکہ آگے چل کر ایک جامع اسکیم تیار کی جا سکے۔

خلاصہ ان تجاویز کا یہ تھا کہ پہلے پنجاب میں ایک خاص فضا پیدا کی جائے اور اس کے بعد صاف طور پر میدان میں آکر تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔

کراچی واپسی اور رپورٹ:

میں ایک ہفتہ لاہور میں رہا، کچھ لوگوں سے ملا۔ بیانات نکلوائے اور واپس کراچی آگیا۔ میں نے سر عبداللہ ہارون کی خدمت میں رپورٹ پیش کر دی کہ پنجاب میں کام کرنے کے گنجایش اور آدمی موجود ہیں۔ میں نے ان کو یہ بھی اطمینان دلایا کہ مولانا مہر کمالِ تندہی سے کوشش کر رہے ہیں کہ وہاں کے حکمراں طبقے کو ہمارے موقف کا قائل بنائیں۔

سر عبداللہ ہارون نے میری اس رپورٹ کی بنیاد پر دہلی جا کر مسلم لیگ کونسل سے اس پروپیگنڈا کمیٹی کی تشکیل کروائی جس کا کچھ ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔

(۲۹ رفروری ۱۹۷۲ء)

باب چہارم :

تحریک پاکستان کا ایک گم شدہ ورق

بعض خاص مطالب کا اعادہ :

پچھلے باب میں اُس کمیٹی کا ذکر ہو چکا ہے جو سر عبداللہ ہارون مرحوم کی تجویز پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے (آخر ۱۹۳۸ء میں) اس مقصد سے منتخب کی تھی۔ کہ اندرون اور بیرون مسلم لیگ تحریک کے حق میں پروپیگنڈا کی مہم منظم کرے، اور جس کمیٹی کو سر عبداللہ ہارون مرحوم فی الحقیقت نظریۂ پاکستان کو پروان چڑھانے اور مقبول عام بنوانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مَیں انہی ابواب میں یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس وقت تک :

(۱) مسلم لیگ نے نظریۂ پاکستان کو اپنایا ہوا نہیں تھا۔

(۲) عام مسلمان اس نظریہ کی افادیت سے نا آشنا تھے۔

(۳) قائد اعظمؒ خود بھی اس کے قائل نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ اس وقت تک انھوں نے کانگریس سے خط و کتابت کے دوران میں کبھی پاکستان کا ذکر نہیں کیا تھا۔

(۴) پاکستان اسکیم بطور ایک قابلِ عمل سیاسی فارمولا، ہنوز مرتب نہیں ہوئی تھی۔

(۵) اور سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں تقسیم ملک کے اصول کو مسلمانوں سے منوانا تھا کیوں کہ تقسیم ملک کی صورت میں ان کو باقی مسلمانوں سے کٹ کر ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا تھا۔ یہ صریحًا ایک عظیم قربانی پیش کرنے کا سوال تھا اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو اس کے لیے رضامند کرنا تھا۔

سر عبداللہ ہارون نے ان جملہ مقاصد کے حصول کے لیے محولۂ بالا کمیٹی سے کام

لینے کا پروگرام بنایا ہوا تھا تاکہ جس نظریئے کو وہ آگے بڑھانا چاہتے تھے اس کو شروع ہی سے مسلم لیگ کا "کور" حاصل رہے۔ کمیٹی کے چیرمین تو وہ خود بنے مگر باقی کام انھوں نے مولانا مہر اور راقم الحروف پر چھوڑ دیے۔ یعنی صورت یہ بنی کہ نام اور روپیہ عبداللہ ہارون کا، دماغ غلام رسول مہر کا، اور دفتری کام اس خادم کے سپرد۔ کمیٹی کی افتتاحی میٹنگ لاہور میں ہو جانے کے بعد اب اصلی کام کی ابتدا ہوگئی۔ اس افتتاحی میٹنگ کا ذکر سرسری طور پر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔

کراچی لیگ کانفرنس والی قرارداد شائع ہو جانے کے بعد ہندو پریس نے پاکستان کے خلاف طوفان بپا کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس نظریے کی طرف پہلے سے متوجہ کر دیا تھا۔ مولانا مہر مرحوم اور سر عبداللہ ہارون نے اب یہ طے کیا کہ :۔

(۱) کمیٹی کی طرف سے مسلمانوں کی اکثریت اور اقلیت والے صوبوں کے مابین وفود کا تبادلہ ہو۔ یعنی اقلیت والے صوبوں سے کچھ مسلمان لیڈر اور مقرر اکثریت والے صوبوں میں بھیجے جائیں اور وہ ان صوبوں کا دورہ کر کے جگہ جگہ مسلمانوں کو یہ بتائیں کہ کانگریسی صوبائی وزارتوں نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں پر کیا مظالم ڈھائے ہیں۔ اور اسی طرح اکثریتی صوبوں کے وفود اقلیتی صوبوں کا دورہ کر کے وہاں کے مسلمانوں کو بتائیں کہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے راہِ نجات صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ ملک تقسیم ہو اور اس کے ایک حصے پر مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت قائم ہو جو بوقت ضرورت دوسرے صوبوں کی مسلم اقلیت کی بھی مدد کر سکے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت کے تحفظ کا مسئلہ :

"مسلم اقلیت کی مدد" والا نکتہ ایک خاص اور بنیادی نکتہ تھا جس کے معنی ہمارے ذہنوں میں یہ تھے کہ مسلمانوں کی نئی آزاد حکومت (یعنی پاکستان) اپنے اوپر یہ ذمہ داری عائد کر دے گی کہ اگر ہندوستان میں چھوڑی ہوئی مسلم اقلیت پر کسی وقت بھی ہندو حکومت کی طرف سے کوئی ظلم ہوا تو مسلمانوں کی یہ حکومت اس کے بارے میں

ہندوستان کے خلاف مثبت اور موثر اقدام کر کے مسلمانوں کا تحفظ کرے گی۔

(۲) برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کے لیے آزاد وطن کے قیام کے بارے میں جتنی تجاویز شائع ہو چکی ہیں ان کی چھان بین کر کے ایک جامع اور قابلِ عمل اسکیم مرتب کی جائے جس کی بنا پر پہلے تو مسلم لیگ کو نظریۂ پاکستان کو اپنانے پر آمادہ کیا جا سکے؛ اور اس کے بعد اس کو بطورِ ایک سیاسی مطالبے کے ہندوؤں اور انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

وفود کی تشکیل :

جہاں تک وفود کی تشکیل کا سوال تھا یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اخراجات کا بوجھ تو سارے کا سارا سر عبداللہ ہارون نے خود اٹھایا ہوا تھا مگر ایسے مسلم لیگی لیڈروں اور مقرروں کا دستیاب ہونا قدرے دشوار سمجھا جا رہا تھا جو اس وقت کی مسلم لیگ کی "سرکاری" آئیڈیالوجی کو پسِ پشت ڈال کر تقسیمِ ملک اور قیامِ پاکستان کے لیے کھل کر پروپیگنڈا کرنے کی جرأت کر سکیں۔ میں نے لاہور میں بیٹھ کر مولانا مہرؔ کے مشورے سے ایسے مسلم لیگیوں کی ایک فہرست تیار کی جن کے بارے میں اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ ہماری تجویز اور پروگرام کے مطابق مجوزہ وفود میں شامل ہو کر اور صوبوں میں پھر کر کام کر سکیں گے۔ خوش قسمتی سے ہندو پریس کے مخالف پروپیگنڈا کے وجہ سے پاکستان اور تقسیم ملک کا تخیل مسلمانوں میں کسی قدر مقبولیت حاصل کر چکا تھا، لہٰذا کئی ایک مسلم لیگی لیڈر ہمارے پروگرام کے مطابق مجوزہ وفود میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ وفود دو مہینے کے اندر اندر مرتب ہو کر سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔ اور انھوں نے تقسیم کے حق میں فضا اس قدر سازگار بنالی کہ خود مسلم لیگی ہائی کمانڈ کو اس موقف کا نوٹس لینا پڑا۔ اور قائداعظم رح کی وہ تاریخی تقریر جو انھوں نے اندھیری کالج میں کی اور جس میں انھوں نے اپنی زبان سے پہلی بار پاکستان کی طرف اشارہ کیا ان وفود کی مساعی سے پیدا شدہ تاثر کا نتیجہ تھی۔

مولانا مہرؔ اور پاکستان اسکیم : ایک طرف یہ کام ہو رہا تھا دوسری طرف

مولانا مہر نے دہلی میں بیٹھ کر پاکستان اسکیم مرتب کرنے کے مقصد سے تحقیق اور مطالعے کا کام شروع کر دیا۔ ان کی رہائش کے لیے سر عبداللہ ہارون نے ونڈسر پلیس والے اپنے اسمبلی کوارٹر میں انتظام کر دیا۔ میں مولانا کی خدمت میں بحیثیت سکریٹری موجود رہا۔ وہ صبح سے شام تک اس کام میں مصروف رہے۔ جن حضرات نے اس موقف کے سلسلے میں کسی وقت کچھ لکھا تھا ان سے رابطہ پیدا کیا۔ بعض حضرات سے ان کے یہاں جا کر بالمشافہ باتیں کیں۔ چند ایک حضرات کو دہلی بلا کر اپنے ساتھ رکھا۔

تحریک پاکستان کے چند مربی :

کچھ نام مجھے یاد ہیں : مثلاً سید اختر حسین جو یو پی لیجسلیچر کے اپر ہاؤس کے ممبر اور جسٹس سر شاہ سلیمان مرحوم کے قریبی رشتے دار تھے۔ جناب رضوان اللہ مرحوم ممبر یو۔ پی اسمبلی جنھوں نے پاکستان بن جانے کے بعد کراچی آکر اقامت اختیار کی۔ ڈاکٹر افضال قادری صاحب جو اب کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم حیدر آباد دکن والے، سر شاہنواز خان ممدوٹ مرحوم، غلام احمد پرویز جو اس زمانے میں گورنمنٹ ہند کے کسی محکمے سے وابستہ تھے۔ اور لاہور کے ایک دانشور جنھوں نے "A PUNJABI" کے نام سے ایک اسکیم شائع کروائی تھی۔

بعض مواقع پر مولانا مہر براہِ راست جسٹس سر شاہ سلیمان مرحوم سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ سر شاہ مرحوم اس زمانے میں فیڈرل کورٹ کے جج تھے اور نظریۂ پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ وہ اپنے عہدے کی نزاکت کا خیال رکھے بغیر ہر وقت ہماری رہنمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔

تحریک پاکستان اور مسلمان سرکاری افسر :

ایک بات خاص طور سے نوٹ کرنے کے قابل تھی۔ وہ یہ کہ جن حضرات کے اسمائے گرامی میں ابھی بتا چکا ہوں ان کے سوا کسی اور مسلمان سرکاری افسر نے اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو "پاکستان" کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے رہتے تھے، اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو، ان سے خفا نہ ہو جائے ونڈسر پلیس

کے راستے سے گزرتے ہی نہیں تھے۔

ایک لیگی لیڈر:

سندھ کے ایک بہت بڑے لیگی لیڈر صاحب ان دنوں دہلی آکر عبداللہ ہارون کے یہاں مہمان ہوئے۔ شام کو وہ کناٹ سرکس کی سیر فرمانا چاہتے تھے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر میں نے کام چھوڑ کر ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ خفا ہو کر فرمانے لگے: "تم اور مولانا قہر خواہ مخواہ پاکستان جیسے NON-SENSE کے لیے اپنا سر کھپا رہے ہو۔ یہ چیز نہ ہوتی ہے اور نہ کبھی ہو گی"۔

بعد میں جب پاکستان بن گیا تو اس زمانے کے کئی جغادری افسر اور خود یہ لیڈر صاحب پاکستان کے مرکز اور صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے اور لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کرتے رہے کہ وہ شروع سے پاکستان کے لیے کام کرتے رہے تھے حالانکہ ان کے یہ دعوے غلط تھے۔ ان کی ہمدردیاں پاکستان کی طرف اس وقت مڑیں جب ان کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان کا وجود میں آنا اب ناگزیر ہے۔

قرارداد لاہور کی اصل بنیاد:

مولانا قہر کو پاکستان اسکیم کو آخری صورت دینے میں سات مہینے کا عرصہ لگا۔ ان کی تیار کردہ رپورٹ شروع فروری ۱۹۴۰ء میں مرکزی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھ دی گئی، اور اس کو دیکھ کر اور اسی کی روشنی میں وہ قرارداد مرتب ہوئی تھی جو مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور والے اجلاس میں منظور ہو کر "قرارداد پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی۔

مولانا قہر کی مرتب کردہ اسکیم کے مندرجات اور خصوصیات کیا تھیں؟ جو پاکستان بعد ں بنا وہ اُس اسکیم کے مطابق تھا یا اس کے برعکس؟ مولانا والی اسکیم کو مسلم لیگ کے مرکز کیوں مخفی رکھنے کی کوشش کی؟ اس اسکیم پر عمل نہ ہونے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ اور چند دلچسپ اور تاریخی حقایق اگلے باب میں پیش کروں گا۔

باب پنجم :

مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کا حقیقی پس منظر

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی لائف پر جو سلسلہ مضامین میں چلا رہا ہوں آج کے مضمون کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے اس کا تعلق مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ والے تاریخی اجلاس سے ہے جہاں ۲۳ مارچ کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔

قرارداد پاکستان اور لاہور سیشن پر آج سے پہلے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اس سیشن یا اجلاس کے حقیقی پس منظر کو کسی نے اب تک نہیں چھوا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ یہ اجلاس لاہور میں اس لیے بلایا جا رہا تھا کہ صوبہ پنجاب میں اس وقت تک مسلم لیگ کا پیغام پورے طور سے نہیں پہنچ سکا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب پر یونینسٹ پارٹی کا راج تھا جو مسلمانوں، ہندو جاٹوں اور زراعت پیشہ سکھوں کی مخلوط پارٹی تھی۔ پارٹی کے لیڈر اور صوبے کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان مرحوم تھے۔

سکندر حیات کے اصول سیاست :

سر سکندر کے اصول، جہاں تک میں سمجھ سکا تھا یہ تھے :

(۱) آل انڈیا مسائل میں مسلمانوں کی ضرور مدد کی جائے۔

(۲) مگر وہ اس طرح سے نہیں کہ ان کی اپنی صوبائی یونینسٹ پارٹی ٹوٹ جائے۔

(۳) مسلم لیگ تحریک سے وابستگی ضرور رہے۔

(۴) مگر یہ وابستگی اس حد تک نہ ہو کہ پنجاب کی صوبائی سیاست پر بھی مسلم لیگ حاوی ہو جائے۔ لہٰذا مسلم لیگ تحریک کو اندرون پنجاب ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو پنجاب کی صوبائی اور لیگی قیادت ایسے آدمیوں کے حوالے رہے جو ان کے حکم اور ان کی صوبائی پارٹی کے مفادات کے مطابق

چلتے رہیں۔

(۵) پنجاب کی پوزیشن اور وہاں کے لوگوں کے مفادات کے تحفظ کو باقی ہر چیز پر مقدم سمجھا جائے۔

سکندر حیات کی ایک خوبی :

سر سکندر حیات خان اس دور کے بہت بڑے مسلمان مدبر تھے۔ ان میں اسلامی جذبہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر ان کی سیاست کاملاً جذباتی نوع کی بھی نہیں تھی۔ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ جذبات کو ایسے حدود کے اندر رکھا جانا چاہیے کہ وہ ایک سیلاب کی صورت اختیار کر کے عقل و تدبر، ملکی مفاد و سیاسی مصلحتوں کے تقاضوں کو یکسر بہا کر نہ لے جائیں۔ یہ ایک عجیب بات میں نے ان میں پائی کہ ان کا دل و دماغ بیک وقت ان کا ساتھ دیتے رہتے تھے، اور ان دونوں کے عمل میں کامل ہم آہنگی اور توازن کی کیفیت پائی جاتی تھی۔

میں ایک دو مثال پیش کروں گا۔

قلب و ذہن کا بے مثال توازن :

سر سکندر کے فرزند اکبر سردار شوکت حیات خان اس زمانہ میں اپنی فوجی ملازمت کے سلسلے میں یورپ کے محاذ پر گئے ہوئے تھے۔ سر سکندر کو ایک صبح اطلاع موصول ہوئی کہ شوکت حیات لاپتا ہیں۔ ممکن ہے کہ جرمن افواج نے ان کو گرفتار کر لیا ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مارے گئے ہوں۔ اور ان کی لاش نہ ملی ہو۔ سر سکندر کو یہ اطلاع فوجی ہیڈ کوارٹر سے ملی۔ ان کے بیڈ روم میں شوکت حیات کی تصویر لگی رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ بیٹے کے لاپتا ہونے کی خبر سن کر بیڈ روم میں گئے اور وہ تصویر اٹھا کر کئی گھنٹے تک اس کو چومتے رہے اور آنسو بہاتے رہے۔ اسی روز شام کو ان کے یہاں ایک نہایت ہی اہم سیاسی میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا اتھر ادریں بھی شریک ہوئے۔ میٹنگ کے کاروبار کو انھوں نے ایسے طریقے اور اس قدر حاضر دماغی اور اطمینان سے انجام دیا کہ مجھ قطعاً یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ شخص سارا دن اپنے

اپنے لاپتا بیٹے کی یاد میں روتا رہا۔ جب میٹنگ ختم ہوئی تو مولانا تھہر نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤں۔ سبب پوچھا تو انھوں نے اوپر والا واقعہ بتا دیا۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ جب باقی لوگ چلے جائیں تو میں تنہائی میں ان سے ہمدردی کا اظہار کروں۔ یہ خبر اس وقت تک مخفی رکھی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے مولانا کے ارشاد کی تعمیل تو کر دی۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ سر سکندر اپنے بیٹے کا نام سن کر وہاں سے اٹھ گئے، اور پھر کمرے میں جا کر رونے لگے۔ البتہ جہاں تک میٹنگ کی کارگزاری کا تعلق تھا اس کے دوران میں ان کی غمزدگی اور دلی کیفیت کا کسی شخص کو سراغ نہیں ملا۔ جو رائے انھوں نے دی وہ ان کے دماغ کی سالمیت پر دلالت کرتی رہی۔

میں نے کئی برس کے تعلق کے دوران میں صرف ایک مرتبہ یہ دیکھا کہ وہ جذبات سے کچھ وقت کے لیے مغلوب ہو چکے تھے۔ وہ واقعہ بھی سن لیجیے:

خاکساروں پر فائرنگ:

مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہونے میں صرف چند یوم رہ گئے تھے کہ خاکساروں پر پولیس کی فائرنگ والا مشہور واقعہ رونما ہوا۔

واقعہ کا پس منظر یوں تھا کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور خاکساروں میں کچھ عرصے سے اندر ہی اندر سے چلی ہوئی تھی۔ یعنی مسلم لیگی حلقوں میں یہ اندیشہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ خاکسار بوجہ سیاسی رقابت مسلم لیگ سے تصادم کے درپے ہیں اور موقع کی تلاش میں ہیں۔ باوجود اس کے کہ جب علامہ مشرقی مرحوم مغفور کو یوپی کی صوبائی حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا تھا تو ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اور سر شاہ سلیمان مرحوم کے کہنے پر قائداعظم علیہ الرحمۃ نے حکومت پر دباؤ ڈال کر علامہ مرحوم کو آزاد کروایا تھا۔ مگر ان کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی قائداعظم رح اور علامہ مرحوم کے مابین کسی قدر ذہنی آزردگی کی کیفیت باقی رہ گئی تھی۔ اس سلسلے میں بھی ایک دلچسپ قصہ سن لیجیے:

علامہ مشرقی اور قائداعظم:

حضرت علامہ مشرقی مرحوم جب قائداعظم رح کی کوششوں سے یوپی کی جیل سے

آزاد ہو کر دہلی تشریف لاتے تو توقع یہ کی جاتی تھی کہ وہ قائداعظمؒ کے یہاں آکر ان سے ملاقات کریں گے، اور ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ مگر علامہ صاحب مرحوم نے اپنی طرف سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ قائداعظمؒ خود پہلے ان کے کیمپ قرول باغ میں آکر ان سے ملیں اور اس کے بعد ہی علامہ صاحب مرحوم جوابی ملاقات کے لیے ان کے یہاں جائیں گے۔ دونوں کے بیچ میں سفارت، وکالت اور پیغام رسانی کے فرائض ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوزیشن بے حد نازک تھی۔ وہ علامہ صاحب مرحوم سے اس وجہ سے ڈرتے تھے کہ وہ انہی دنوں خاکسار بن کر کاندھے پر بیلچہ اٹھا چکے تھے، اور اس لحاظ سے علامہ صاحب ان کے قائد تھے۔ دوسری طرف جناح صاحبؒ جیسے خود دار اور ساری قوم کے قائد سے ان کا واسطہ پڑ رہا تھا۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب نے ڈرتے کانپتے قائداعظم کو علامہ صاحب کا یہ پیغام سنایا تو میں بھی قائداعظم کی خدمت میں موجود تھا۔ قائداعظم نے اطمینان اور خندہ پیشانی سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سماعت فرمائیں، اور ان سے کہا کہ وہ شام کو آکر جواب حاصل کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب کی روانگی کے فوراً بعد قائداعظمؒ نے قائدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم اور سر عبداللہ ہارون مرحوم کو اپنے یہاں بلا لیا۔ میں بھی حاضر رہا۔ حضرت علامہ صاحب مرحوم کے پیغام پر گفتگو ہوئی۔ ماحصل گفتگو کا یہ تھا کہ علامہ صاحب مرحوم قائداعظمؒ کو پہلے اپنے یہاں حاضری دینے پر مجبور کر کے دنیا کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ فی الوقت مسلمانوں کی سیاست میں اوّلیت اور افضلیت کی پوزیشن علامہ صاحب کو حاصل ہے اور جناح صاحب اور ان کی مسلم لیگ تحریک کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ لہٰذا سوال یہ تھا کہ کیا مسلم لیگ کو علامہ صاحب کی ایسی ڈپلومیسی کے سامنے جھک جانا چاہیے یا نہیں؟ عبداللہ ہارون مرحوم نے یہ رائے دی کہ "یہ وقت آپس میں زور آزمائی یا اولیت یا ثانویت ثابت کرنے کا نہیں ہے۔ ہم پاکستان کی طرف پہلا مثبت قدم اٹھانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایسے وقت اگر مسلم لیگ اور خاکساروں کے مابین جھگڑا چھڑ گیا تو اس کا فائدہ کانگریس اٹھائے گی۔ ہم کو دفع الوقتی کے طور پر علامہ صاحب

کی بات مان لینی چاہیے اور قائداعظم کو ان کے یہاں چلنا چاہیے۔ آگے جو کچھ ہوگا وہ دیکھ لیں گے۔" خود قائداعظمؒ اور قائد ملتؒ نے سر عبداللہ ہارون مرحوم کی رائے سے اتفاق فرمایا اور یہ طے پایا کہ اسی روز شام کو قائداعظمؒ علامہ صاحب سے ملنے کے لیے قرول باغ تشریف لے چلیں گے۔ قائداعظمؒ نے ہم لوگوں کو حکم دیا کہ ہم کو بھی ان کی خدمت میں چلنا ہوگا۔

مقررہ وقت پر قائداعظمؒ اور ان کی خدمت میں ہم لوگ (قائد ملتؒ، سر عبداللہ ہارون مرحوم اور راقم الحروف) دو موٹروں میں سوار ہوکر قرول باغ پہنچے۔ علامہ صاحب کی اقامت خاکسار کیمپ کے وسط میں ایک بڑے خیمہ میں تھی۔ اندر فرش پر معمولی دری بچھی ہوئی تھی۔ کرسی وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔ دری پر بھی کافی مٹی جمی ہوئی تھی۔ قائداعظمؒ سفید پائنا سلک کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ زمین پر بیٹھنے کے عادی نہیں تھے۔ مگر علامہ صاحب سے مصافحہ کے بعد مجبوراً دری پر ہی بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے اپنا سگریٹ کیس جیب سے نکال کر ایک سگریٹ علامہ صاحب کو آفر کی۔ علامہ صاحب سگریٹ لے کر قمیض کے جیب سے دو پیسے نکال کر قائداعظم کو دینے لگے۔ قائداعظمؒ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟

علامہ صاحب مرحوم: "خاکسار کوئی چیز بلاقیمت ادا کیے قبول نہیں کر سکتا۔"

قائداعظمؒ "میری سگریٹ کی قیمت دو پیسہ سے بہت زیادہ ہے جو آپ نہیں ادا کر سکتے۔" یہ فرماتے ہوئے قائد نے ہاتھ بڑھا کر اپنی سگریٹ علامہ صاحب سے واپس لے لی۔

اس کے بعد علامہ صاحب نے قائداعظمؒ کو تلقین فرمائی کہ ان کو باقاعدہ اور باجماعت پانچ وقت کی نماز پڑھنی چاہیے۔ جیسے ہی وہ یہ کہہ رہے تھے، باہر کسی نے اذان دے دی۔ اور ملاقات ختم ہوگئی۔ قائداعظمؒ اور ہم لوگ واپس آگئے۔

مسلح تنظیموں پر پابندی:

اس واقعے سے قارئین کرام پر خاکسار تحریک اور مسلم لیگ کے باہمی تعلقات کی

نوعیت کسی قدر واضح ہو گئی ہو گی۔ بہر حال مختصراً میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ ان دنوں دونوں کے تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں سر سکندر حیات خان مرحوم نے قائداعظم کو بتا دیا تھا کہ "ڈیفنس آف انڈیا" رولز کے تحت وہ اپنے صوبے میں ایسی تمام نجی والنٹیر تنظیموں پر پابندی عائد کرنے پر مجبور ہیں جو باوردی کرپان، لاٹھیاں، تلواریں یا بیلچہ اٹھائے راستوں پر پریڈ کرتی رہتی ہیں۔ اس وقت عالمی جنگ جاری تھی، اور اس کی مصلحتوں کے پیش نظر حکومت ہند نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا تھا جس کی رو سے اس قسم کی "پریڈیں" ممنوع تھیں۔ نیم فوجی تنظیمیں سکھوں اور ہندوؤں نے بھی قائم کر لی تھیں، اور پنجاب میں خاص طور سے ان کا زور تھا۔ نئے قانون کا اطلاق ان سب پر ہوتا تھا اور ہوا۔

سر سکندر نے ورکنگ کمیٹی کو یہ اطلاع دینے کے بعد نجی پریڈوں کو خلاف قانون قرار دینے کا حکم نافذ کر دیا۔ اور خاکساروں نے لاہور چھوڑ کر جہاں ان کا مرکز تھا۔ دہلی کے قرول باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا اور علامہ صاحب بھی وہاں رہنے لگے۔

خاکساروں کی قانون شکنی:

اب جب لاہور میں مسلم لیگ اجلاس کے منعقد ہونے میں صرف دو چار دن رہ گئے تھے تو خاکساروں نے رائج الوقت قانون توڑ کر وہاں باوردی پریڈ کا اہتمام کر دیا۔ پولیس نے ان کو روکنا چاہا جس پر دونوں میں تصادم ہو گیا۔ ایک پولیس، اے ایس پی مارا گیا، اور کئی خاکسار زخمی اور شہید ہو گئے۔

سر سکندر جائے واردات دیکھنے اور زخمی خاکساروں کی ہسپتال جا کر عیادت کرنے کے بعد واپس اپنے مکان پر پہنچے تو مولانا مہر اور راقم الحروف وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہماری اس وقت کی موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا کہ خاکساروں اور پولیس میں تصادم ہوا ہے اور شدید فائرنگ ہوئی ہے تو وہ فوراً مسلم ٹاؤن سے روانہ ہو کر اچھرہ روڈ پر میرے مکان پر پہنچ گئے تھے، اور وہاں سے مجھے اپنے ساتھ لے کر سر سکندر کی کوٹھی پر آ گئے تھے۔ میرا یہ مکان خاکساروں کے ادارۂ عالیہ کے بالکل عقب میں واقع تھا اور

اس وقت میں نے سنا ہے کہ جماعت اسلامی کے مرکز کے حوالے ہے۔

جس وقت مولانا مہر میرے مکان پر تشریف لائے تو وہ میرے سونے کا وقت تھا اور میں حسب دستور قیلولہ میں تھا۔ مولانا نے نیچے سے شور مچا کے مجھے اٹھا دیا۔ وہ خود نیچے صحن میں کھڑے تھے، اور میں نے اوپر سے ان سے سوال وجواب شروع کر دیا۔

راقم الحروف: "کیا ہو گیا ہے کہ آپ نے اس وقت آکر اس قدر شور مچا رکھا ہے؟"

مولانا: "ارے! جلدی اترو نیچے۔ ظلم ہو گیا۔ سب چیز ختم ہو گئی"

راقم الحروف: "تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس وقت مجھے آرام کرنے دیجیے"۔

مولانا: بڑے بے رحم ہو۔ فضول بات مت کرو۔ فوراً اتر آؤ۔ تمہارا کیا کرایا سب ختم ہو رہا ہے۔ تمہارا پاکستان، واکستان مر گیا"

عین اس وقت چودھری عبدالمجید تھانے دار علاقہ اچھرہ بھی انتہائی سراسیمگی کی حالت میں ہمارے یہاں پہنچ گئے۔ وہ دہی کی تلاش میں تھے کیوں کہ قریبی ادارۂ عالیہ میں موجود خاکساروں پر اشک آور گیس کے گولے پھینکے گئے تھے اور ان کا اثر تھانے دار صاحب کی اپنی آنکھوں پر بھی ہوا تھا جس کو مٹانے کے لیے وہ اپنی آنکھوں میں دہی ڈالنا چاہتے تھے۔

بالآخر میں مولانا کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر باہر بڑے راستے یعنی اچھرہ روڈ پر آیا تو وہاں فوج اور پولیس کے دستے ہتھیاروں اور زرہوں سے لیس گشت کرتے دیکھے۔ ان کا سربراہ لاہور کا انگریز ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فریڈرک بورن تھا جس کو پاکستان بن جانے کے بعد قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا تھا۔ سر سکندر سے ہمارا ملنا ہوا تو ہم نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ ابھی دیکھ آئے تھے اس سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ان کی زبان میں کسی قدر لکنت آگئی تھی۔ اور ہم کو محسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ غالباً اب اپنا عہدہ چھوڑ چھاڑ کر سیاست سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ مولانا مہر نے ان کی تالیف قلب کے لیے ایک مختصر سی تقریر کی، اور ان کو حوصلہ دلانے کی کوشش کی۔ مولانا کی تقریر سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ

"میرا دماغ اب بھی مختل نہیں ہوا ہے۔" مجھے افسوس دو باتوں کا ہے :
ایک یہ کہ اتنے نوجوان انسانوں کی جانیں محض اس وجہ سے ضائع ہو گئیں کہ کسی کو اپنی سیاسی قوت جتانی تھی۔
دوسری افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج کل میں مسلم لیگ کا اجلاس ہونے والا ہے، اور اس واقعے کی وجہ سے مسلمانوں کی مجموعی پوزیشن پر آنچ آنے کا احتمال ہے۔ دنیا ہماری طرف دیکھ رہی ہے، اور ہم یہ حرکتیں کر رہے ہیں۔"

میں بھی بیچ میں بول پڑا۔ میں نے عرض کیا کہ "یہ وقت مغموم اور مایوس ہونے کا نہیں۔ ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہم کو اس سے نکلنے کے لیے ہمت سے کام لینا چاہیے۔ پھر میں نے پوچھا کہ "کیا موجودہ حالات میں مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی کرانا چاہیے؟" انھوں نے فرمایا: "ہرگز نہیں۔ اگر یہ اجلاس اب ملتوی ہو گیا تو مسلم لیگ کی تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اور پاکستان مانگنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

کچھ مزید گفتگو کے بعد طے یہ ہوا کہ دس بجے رات پارٹی کے سربرآوردہ ارکان کی میٹنگ ہو جس میں مستقبل کے بارے میں طریقہ کار پر غور کیا جائے۔ دس بجے والی میٹنگ میں ہم بھی موجود تھے۔ سر سکندر نے جس طرح حالات و واقعات پر تبصرہ کیا اور آیندہ کے لیے پروگرام پیش کیا اس سے ثابت ہو گیا کہ جذبات کی شدت سے ان کا دماغ قطعاً متاثر نہیں ہوا تھا۔ ان کی دماغی قوت کا اس سے بھی زیادہ مظاہرہ اس وقت ہوا جب انھوں نے چند دن بعد لیگ کونسل اور سبجیکٹس کمیٹی کے مشترکہ اجلاس کے سامنے اور قائداعظمؒ کی موجودگی میں خاکساروں پر فائرنگ والے مسئلہ کے بارے میں حکومت پنجاب کا موقف پیش کیا اور بعض ممبر جوان کو بقول شخصے "کچا چبانے کے لیے" گھروں سے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ بھی ان کے پیش کردہ جواز کے قائل ہو گئے، اور اس بات پر رضامند ہو گئے کہ معاملے کی تحقیقات ہائی کورٹ ججوں کے ذریعے کروائی جائے بعد میں

لوگ یہ تحقیقات کرانا بھی بھول گئے۔

ایک مسلم لیگی رہنما:

اس سلسلے میں ایک اور عجیب بات بتانا بھی ضروری ہے مجھ کو اسی روز معلوم ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ کی اپنی مجلس استقبالیہ کے ایک ذمے دار عہدے دار نے مخفی طور پر ایک خط علامہ مشرقی کو جو دہلی میں تھے لکھا تھا جس میں ان کو اکسایا گیا تھا کہ وہ اجلاس سے چند دن پہلے لاہور میں "سول نافرمانی" کروا دیں تاکہ مسلم لیگ کا اجلاس رک جائے۔ جناح صاحبؒ اور سکندر حیات کے آپس کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں، اور جناح صاحبؒ سکندر حیات کو وزارت اعلیٰ سے نکال کر انھیں یعنی خط لکھنے والے صاحب کو ان کی جگہ پر بٹھا دیں۔ انھوں نے علامہ صاحب کو یقین دلایا تھا کہ وزارت اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھتے ہی وہ خاکساروں پر سے پابندی اٹھا دیں گے، اور پنجاب میں اس طرح سے خاکساروں کا بول بالا ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ (حضرت علامہ صاحب مرحوم اس خط سے کسی قدر متاثر ہوئے یا نہیں ہوئے یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا البتہ یہ یقینی بات تھی کہ خط ان کو پہنچا دیا گیا تھا۔)

بد قسمتی سے صاحب تحریر میرے بھی گہرے دوست تھے، اور میں اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان کی پردہ دری کر کے ان کو نقصان پہنچاؤں یا ان کو معتوب کروا کر اجلاس کے انتظام میں رخنہ ڈلواؤں۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں خط کی نقل لے کر براہ راست ان سے جا کر ملا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ انھوں نے یہ خط لکھ کر سخت مکروہ حرکت کی ہے۔ اگر اس خط کی خبر کسی ذریعے سے سر سکندر تک پہنچ گئی تو ان کی شامت آجائے گی۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ وہ ان ریشہ دوانیوں سے باز آکر پہلے سے زیادہ کھل کر سر سکندر کا ساتھ دیں، اور مسلم لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنوائیں تاکہ ان کے اس عمل سے خط کے مندرجات کی تردید ہو جائے، اور اگر خط کی بات کھل بھی جائے تو اس پر کوئی شخص اعتبار نہ کرے۔

چنانچہ انھوں نے میرے مشورے پر عمل فرمایا اور اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے مسلم لیگ کے اجلاس کی کامیابی کے واسطے پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ کام

شروع کر دیا، اور یہ بات وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔ مَیں نے کبھی سر سکندر مرحوم یا جناح صاحب مرحوم یا کسی اور شخص کو نہیں بتایا کہ خاکساروں والے معاملے کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔ آج پہلی بار مَیں اس پر سے پردہ اٹھا رہا ہوں۔ کیوں کہ اب اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

رجوع الی المقصود :

مَیں قارئین کرام سے معافی چاہتا ہوں کہ مَیں اصل موضوع سے بہت دُور نکل گیا، اور پس پردہ جو سیاسی ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں ان کا قصہ بیان کرتے کرتے اور سر سکندر حیات خان مرحوم کی عظیم شخصیت کو نئی نسل سے روشناس کراتے کراتے اصلی راستہ سے کافی بھٹک گیا۔

جہاں تک ۱۹۴۰ والے تاریخی اجلاس کا تعلق تھا اس کا کام وسط ۱۹۳۹ سے شروع کر دیا گیا تھا۔

پنجاب کے مسلم لیگی کارکنوں کا اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجھے بھی لاہور میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا، اور مَیں وہاں جا کر رہنے لگا تھا، پہلے نواب صاحب ممدوٹ مرحوم کے یہاں اور اس کے بعد اچھرہ روڈ پر ایک کوٹھی میں۔

استقبالیہ کمیٹی :

استقبالیہ کمیٹی قائم کرنے کے لیے نواب صاحب کے یہاں پہلی میٹنگ بلائی گئی تو نواب صاحب خود اور میرے چند ذاتی دوستوں کے علاوہ اور کوئی صاحب تشریف نہیں لائے۔ نواب صاحب اور میں نے اپنے خیال کے مطابق کمیٹی کے ممبر اور عہدے دار نامزد کر دیے۔ نواب صاحب مرحوم چیرمین، میاں بشیر احمد مرحوم جنرل سکریٹری (میاں صاحب خود اس وقت شملہ میں تشریف فرما تھے) سید خلیل الرحمن سکریٹری، نواب زادہ رشید علی خان جوائنٹ سکریٹری۔ اسی طرح استقبالیہ کمیٹی کی ممبری کے لیے بھی جتنے نام خیال میں آئے وہ قلم بند کر کے شائع کروا دیے گئے۔ در آں حالیکہ اصلی کام نواب صاحب اور ہم لوگوں کو کرنا تھا۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ جن حضرات کو نامزد کیا جا رہا ہے وہ خود کام میں

حصہ لیں گے بھی یا نہیں۔ البتہ بعد میں ہمارا انتخاب لاجواب ثابت ہوا۔ کیوں کہ نامزد عہدے دار اور ممبر صاحبان نے اجلاس کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اختیارات کا استعمال :

ایک لطیفہ اسی سلسلہ میں سن لیجیے۔ اجلاس کے لیے منٹو پارک میں جو پنڈال تیار کیا گیا تھا اس کے باہر صوبائی مسلم لیگیوں کے دفاتر کے لیے چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کر دیے گئے تھے، ایک خیمہ سندھ صوبائی مسلم لیگ کو بھی الاٹ کر دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالحی حقانی مرحوم سندھ صوبائی لیگ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ اپنا سامان لے کر الاٹ شدہ خیمے میں بیٹھ گئے تھے۔ شام کو پنڈال اور کیمپ دیکھنے کے لیے مَیں منٹو پارک گیا تو یہ دیکھا کہ سندھ والا خیمہ زمیں بوس ہے اور مولانا حقانی مرحوم گرے ہوئے خیمے سے باہر ایک بکس کو کرسی بنائے ہوئے کھلے میدان میں بیٹھے ہیں۔ مَیں نے خیمے کے گرنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ استقبالیہ کمیٹی کے ایک عہدے دار صاحب پنڈال اور کیمپ کا معاینہ کرنے کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سندھ لیگ کا خیمہ دیکھتے ہی نیشنل گارڈز کو حکم دے دیا کہ اس کو ابھی ابھی اکھاڑ دیا جائے۔ مَیں نے دریافت کیا کہ وہ عہدے دار صاحب اس وقت کہاں ملیں گے؟ معلوم ہوا وہ اس وقت "پنڈال کو اندر سے دیکھ رہے ہیں"۔ مَیں نے پنڈال میں جا کر "عہدے دار" مذکور سے خیمہ گروانے کا سبب پوچھا؟ انھوں نے یہ جواب دیا :-

"دیکھیے راشدی صاحب! ہم کو یہ عہدہ آپ نے ہی لے کر دیا ہوا ہے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ میں اپنے عہدے کے اختیارات کو استعمال کرنے کا کچھ مزہ لوں۔ اس کام کے لیے مجھے آپ کے صوبہ والا خیمہ ہی مناسب نظر آیا کیوں کہ میں بھی آپ کا اور یہ خیمہ بھی آپ کا۔ میں اس وقت صوبہ سندھ مسلم لیگ کا جنرل سکریٹری بھی تھا، اور مولانا حقانی میرے نائب مقرر ہوتے تھے۔ عہدے دار صاحب نے کہا، کسی دوسرے خیمہ پر میں اپنا اختیار استعمال کرتا تو وہ مجھ سے

لڑ پڑتے۔"

میں نے عرض کیا کہ "اب یہ مقصد تو حاصل ہو گیا اگر اجازت ہو تو خیمہ کو پھر استوار کروا دیا جائے۔" انھوں نے یہ اجازت فوراً عطا فرما دی اور نہ صرف یہ کہ نیشنل گارڈ کو حکم دیا کہ خیمے کو پھر کھڑا کر دیں۔ بلکہ وہ خود وہاں آ کر خیمہ لگانے کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔

پھر ایک اور قصہ سن لیجیے!

نیشنل گارڈز اور عہدے داروں کی اسٹرائیک:

ایک رات دو بجے کے قریب محبوب قریشی مرحوم میرے مکان پر آئے اور یہ خبر دی کہ پنڈال پر متعین نیشنل گارڈ اور عہدے داروں نے اسٹرائیک کر دی ہے، اور وہ پنڈال چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں، اور اب امکان ہے کہ ایسے حالات کا فایدہ اٹھا کر مسلم لیگ کا کوئی دشمن پنڈال کو آگ لگا دے۔ اسٹرائیک کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ چیئرمین استقبالیہ کمیٹی اور سکریٹری صاحب کے مابین کچھ سخت کلامی ہوئی تھی۔ پنڈال کی حفاظت سکریٹری صاحب کے ذمے تھی۔ وہ جب ناراض ہو کر گھر چلے گئے تو نیشنل گارڈ والے بھی کام چھوڑ چھاڑ کر چل دیے۔ معاملہ نازک تھا۔ مسلم لیگ کی مخالفت بہت سخت تھی۔ اجلاسوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اگر ایسے مواقعے پر پنڈال جل جاتا تو قرارداد پاکستان پاس ہونے کا امکان ختم ہو جاتا کیوں کہ پنڈال نہ ہوتا تو اجلاس کہاں ہوتے؟

میں نے پہلے تو اپنے ملازموں اور مہمانوں کو اپنے گھر سے اٹھایا اور اُن کو اپنے ساتھ لے کر پنڈال پہنچا۔ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو پنڈال پر پہرہ دینے کے لیے جگہ جگہ کھڑا کر دیا، اور وہاں سے مزنگ گیا جہاں سکریٹری صاحب کا مکان تھا۔ سکریٹری صاحب کو سمجھا بجھا کر تو واپس لے آیا۔ مگر نیشنل گارڈ اسی رات واپس نہیں بلائے جا سکے۔ چنانچہ اس ساری رات میرے ذاتی ملازم اور باہر سے آئے ہوئے مہمان پہرہ دیتے رہے۔ صبح کو میں نے چیئرمین صاحب سے مل کر ان میں

اور سکریٹری صاحب میں مصالحت کرادی، اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

میاں بشیر احمد کی تاریخی نظم :

پہلے اجلاس کے سامنے تلاوت قرآن مجید کے بعد میاں بشیر احمد مرحوم نے پہلی بار اپنی وہ نظم پڑھی جو بعد میں مسلم لیگ کے ہر اجلاس کے سامنے پڑھی جانے لگی :- یعنی

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ

جب میاں صاحب یہ نظم پڑھ رہے تھے تو ملک الشعراء حضرت حفیظ جالندھری میرے ساتھ ڈائس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا آپ بھی فی البدیہہ کچھ فرمادیں تو تاریخی چیز ہوگی۔ انھوں نے بلاتوقف کہہ دیا "سن لو"

اِک آگ سی لگی ہے جو ہندوستان میں
اس آگ کا دھواں ہے محمد علی جناحؒ

(۲۴ مارچ ۱۹۷۲ء)

باب ششم :

مولانا مہر مرحوم کی مرتبہ "پاکستان اسکیم" پر ایک نظر

باب چہارم کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا تھا :

(۱) "مولانا مہر کی مرتب کردہ پاکستان اسکیم کے مندرجات اور اس کی خصوصیات کیا تھیں ؟

(۲) جو پاکستان بعد میں بنا وہ اس اسکیم کے مطابق تھا یا اس کے برعکس ؟

(۳) مولانا والی اسکیم کو مسلم لیگ کے مرکز نے کیوں مخفی رکھنے کی کوشش کی ؟

(۴) اِس اسکیم پر عمل نہ ہونے کا نتیجہ کیا ہوا ؟"

پاکستان اسکیم کی تیاری :

مولانا مہر نے جو پاکستان اسکیم مرتب کر کے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کو عبداللہ ہارون مرحوم کے ذریعے بھیجی، اور جس کی بنیاد پر قرارداد لاہور تیار ہوئی، وہ مولانا نے دہلی میں بیٹھ کر سات مہینے کی محنت کشی اور مشقت جھیلنے کے بعد بنائی تھی۔ ہندوستان کے جغرافیے اور سیاست پر شاید ہی کوئی کتاب ہو جس کا مطالعہ انھوں نے نہیں کیا۔ ان کی محنت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کے تمام اضلاع کے گزیٹیرز کے علاوہ مردم شماری کی رپورٹیں بھی بڑے غور سے پڑھ ڈالیں۔ سر عبداللہ ہارون مرحوم مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے، اور ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اسمبلی لائبریری یا مرکزی حکومت سے جو کتاب چاہیں عاریتاً لے سکتے تھے۔ اس سہولت کا مولانا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مولانا بیکار گفتگو یا لوگوں سے ملنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ صبح سے ۱۲ بجے رات تک مطالعے میں مستغرق رہتے تھے اور کتابوں اور حکومت ہند کی سالانہ ADMINISTRATION REPORTS کی

چھان بین کرتے رہتے تھے۔ خاص طور سے ان دستاویزات کی، جو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی ترویج سے تعلق رکھتی تھیں اور جس کے معنی یہ تھے کہ انگریز جب سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۲۸ تک آئینی مسائل یا انتظامی اصلاحات پر مبنی لکھی گئی تھیں وہ تقریباً سب کی سب مولانا کی نظر سے گزریں۔

مولانا مہر کا خیال :

جس زمانے وہ یہ کام کر رہے تھے کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ انگریز اس قدر جلد ہندوستان سے نکل جائے گا۔ یا اس قدر آسانی سے پاکستان مل جائے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جدوجہد طویل عرصے تک جاری رہے گی، اور اس کے دو دَور ہوں گے۔ ایک دَور آئینی تحریک کا، دوسرا دَور سول وار کا۔

وہ اکثر فرماتے رہتے تھے کہ پاکستان ہماری نسل کے لوگ تو نہیں دیکھ سکیں گے مگر ہم کو اپنے نصب العین کے جواز اور اس کی تائید میں ایسا ٹھوس CASE بنا کر چھوڑنا ہے کہ مستقبل کی ہماری تحریک آئینی ہو یا سول وار کے قسم کی۔ جب بین الاقوامی دنیا آخری فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھے تو اس کو ہمارے مطالبے اور دعوے کی صحت کا قائل ہونا پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس قدر انہماک اور محنت سے یہ اسکیم تیار کر رہے تھے۔

اسکیم کو مخفی رکھنے کی کوشش :-

یہ ساری اسکیم چھپ چکی ہے۔ مسلم لیگ کے مرکز نے تو بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس کو مخفی رکھنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اس کو حیدر آباد دکن سے چھپوا دیا۔ یہ اسکیم ان کی کتاب THE PAKISTAN ISSUE میں شامل ہے[1]۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے اسکیم کی ایک کاپی اس وقت کے صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بھیج دی تھی۔ اور اس طرح سے وہ کانگریس کے ریکارڈ پر بھی آگئی۔ میں نے سنا ہے کہ سر مارس گوائر کی کتاب "ہندوستان کے متعلق "آئینی دستاویزات" میں بھی غالباً یہ اسکیم پائی جاتی ہے۔

---

[1] کتاب میں اسکیم شامل نہیں۔ صرف اس کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ ہے۔

پاکستان اسکیم کا خلاصہ :

بہر حال مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا :

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہی ان کو رقبہ ملنا چاہیے اور یہ پاکستان ہوگا۔

(۲) اسی اصول کے تحت ان کو مغرب میں ایک طرف تو آگرہ تک کا علاقہ ملنا چاہیے۔ اور دوسری طرف سارا راجپوتانہ مشرق میں ان کا علاقہ سارے بنگال، آسام اور بنگال سے متصل بہار کے ان اضلاع پر جہاں ان کی آبادی نصف کے قریب ہو، مشتمل ہونا چاہیے۔

(۳) اس نقشے کے مطابق مجوزہ پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۶۵ فیصد کے قریب بنتا تھا۔ اور سارے ہندوستان کی مجموعی مسلم آبادی کی تین چوتھائی پاکستان میں آجاتی تھی۔

(۴) جنوب میں حیدر آباد دکن کو اسلامی ریاست تسلیم کیا جائے اور ہندوستان کے جنوبی اضلاع کے مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اگر چاہیں تو وہاں آکر بس جائیں۔

(۵) باقی ریاستیں جن کے حکمران مسلمان ہوں یا جہاں مسلم آبادی کی اکثریت ہو۔ آزاد ریاستیں ہوں۔

(٦) اقلیتوں کو ہندوستان اور پاکستان میں خاص تحفظات حاصل ہوں تاکہ کسی بڑے پیمانے پر لوگوں کے بے گھر ہونے یعنی تبادلہ آبادی کا امکان یا ضرورت باقی نہ رہے۔

اسکیم کے رہنما اصول :

مولانا نے یہ اسکیم ان اصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کی :

(۱) مسلمانوں اور ہندوؤں کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق رقبہ ملے۔

(۲) برصغیر میں دو ایسی حکومتیں قائم ہوں جن کے مابین طاقت کا توازن قائم رہے۔

یعنی ایک ملک کمزور اور دوسرا ملک حد سے زیادہ طاقت ور نہ بن جائے۔ کیونکہ عدم توازن کی صورت میں جھگڑے پیدا ہوں گے اور طاقت ور ملک کمزور ملک کو ہمیشہ پریشان کرتا رہے گا۔ اور اس سے برصغیر کے امن میں خلل واقع ہوتا رہے گا۔

(۳) انتقال آبادی کی ضرورت کم سے کم پیش آئے۔

(۴) جغرافیائی طور پر دونوں ملک اس پوزیشن میں رہیں کہ اپنا دفاع موثر طریقے سے کر سکیں۔

(۵) دونوں قوموں کی ماضی کی تاریخ کے خدوخال برقرار رہیں۔ ہر قوم کے بڑے بڑے تاریخی اور ثقافتی مرکز اسی کے پاس رہیں۔ تاکہ احساس محرومی کی وجہ سے کسی کو کسی سے لڑنے یا کسی خاص علاقے کی واگزاری کے لیے ٹکراؤ کرنے کی ضرورپیش نہ آئے۔

(۶) جو تھوڑی بہت اقلیتیں اس کے بعد بھی دونوں طرف رہ جائیں گی ان کو ان کی خواہشات کے مطابق تحفظات حاصل ہوں تاکہ وہ اطمینان سے اپنی زندگی بسر کر سکیں۔"

قرارداد لاہور کی ایک اہم ترمیم :

ایک واقعہ اس سلسلے میں کافی اہمیت کا حامل ہے :

مولانا مہر کی اسکیم کی بنیاد پر جب قرارداد لاہور کا مسودہ تیار ہو کر سبجیکٹس کمیٹی کے سامنے آیا تھا تو اس میں ایک کمی محسوس کی گئی تھی۔ یعنی مولانا کی اسکیم کے تحت تو ہم کو ہماری اکثریت والے صوبوں کے علاوہ کئی اور علاقے بھی پاکستان میں شامل کرانے تھے (مثلاً دہلی، آگرہ، مغربی یوپی کے کچھ اضلاع، راجپوتانہ، بہار کے کچھ اضلاع، آسام وغیرہ)۔ مگر قرارداد کے مسودے میں اس کے بارے میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ لہٰذا جب حضرت قائداعظمؒ سبجیکٹس کمیٹی کے سامنے قرارداد کا اصلی مسودہ پڑھنے لگے تھے تو میں نے کاغذ کے ایک پرزہ پر تصحیح لکھ کر ان کے ہاتھ میں دے دی تھی جو انھوں

نے بلا تامل اصلی مسودے میں شامل فرما دی تھی۔ تصحیح کے الفاظ یہ تھے :

"SUBJECT TO SUCH TERRITORIALE RE-ADJUSTMENTS AS MAY BE FOUND NECESSARY" اس اضافے کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی واضح اکثریت والے صوبوں کے علاوہ چند ایک اور علاقے بھی حاصل کر لیں مگر افسوس یہ ہے کہ بعد میں انہی تصحیح والے الفاظ سے ہماری اپنی اکثریت والے صوبوں (بنگال اور پنجاب) کی قطع و برید کے لیے جواز نکالا گیا۔ جو نہ تصحیح پیش کرنے والے شخص کا مقصد تھا اور نہ ان لوگوں کا جنھوں نے مولانا مہر کی اسکیم سے متاثر ہو کر سبجیکٹس کمیٹی میں اس تصحیح کو منظور کیا تھا۔

سندھی کی ایک کہاوت ہے "گئی تھی سینگ لینے کان بھی کٹوا کر آگئی"

مولانا مہر کی پاکستان اسکیم سے قائد اعظم کا اعلان بریت :

مولانا کی اسکیم کی بنیاد پر لاہور والی قرارداد پاکستان تو مرتب کر دی گئی تھی مگر بعد میں اس اسکیم کو لیگ ہائی کمانڈ نے منظر عام پر آنے سے روک دیا تھا۔ اور در آنحالیکہ یہ اسکیم لیگ ہی کی ایک کمیٹی نے تیار کی تھی، اس کمیٹی نے بھی یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ خود بھی اس کو اچھالے۔ بعد میں عبداللہ ہارون (مرحوم) کا انتقال ہو گیا تو کمیٹی میں بھی کوئی جان نہیں رہی۔ البتہ ڈاکٹر سید عبداللطیف حیدر آباد دکن والے لیگ کے کنٹرول سے آزاد تھے۔ انھوں نے نہ صرف اسکیم کی ایک کاپی رسمی طور پر صدر کانگریس آنجہانی راجندر پرشاد کو بھیج دی بلکہ اس کو پمفلٹ کی صورت میں بھی چھپوا دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ اقدام قائد اعظمؒ کو اچھا نہیں نظر آیا، انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ اسکیم لیگ کی نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ قائد اعظمؒ نے کن مصلحتوں کے پیش نظر یہ پالیسی اختیار فرمائی۔ غالباً وہ مسلم لیگ کو جملہ پابندیوں اور بندھنوں سے آزاد رکھنا چاہتے تھے تاکہ جب ان کے اور کانگریس کے مابین آخری باتیں ہوں تو ان کے اپنے ہاتھ آزاد رہیں۔ یہ لازمی بات تھی کہ اگر یہ اسکیم لیگ کی طرف سے شائع ہو جاتی اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں میں رائے عامہ اس کی بنیاد پر بنتی اور پختہ ہوتی رہتی تو آگے چل کر اسکیم کے خطوط یا اصلی روح سے ہٹنا باعث اشتعال

و بغاوت بن جاتا۔ مثلاً اس صورت میں ناممکن بن جانا کہ اور علاقوں کا حصول تو درکنار مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی منظور کر لی جائے۔

موجودہ پاکستان :

جہاں تک اس پاکستان کا تعلق ہے جو مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء میں حاصل کیا وہ پاکستان کے اس تخیل سے صریحاً ہٹا ہوا تھا جس تخیل کے زیر اثر مولانا مہرؒ نے اسکیم مرتب کی تھی۔

اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

(۲۷ر مارچ ۱۹۷۲ء)

باب ہفتم :

پاکستان اسکیم سے انحراف کے نتائج

ترمیم کا مقصد اور غلط معنی :

گزشتہ باب میں عرض کر چکا ہوں، جس وقت قرار داد لاہور مرتب ہوئی تو ہمارے لیڈروں کے پیش نظر یہی اسکیم تھی۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ قرار داد کے مسودہ میں آخری وقت پر جو درستی میں نے پیش کی تھی، اور جس کو قائد اعظمؒ نے منظور فرما کر مسودے میں شامل کر لیا تھا اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ مولانا مرحوم کے تیار کردہ تقسیم کے نقشے پر عمل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ درستی کے الفاظ تھے :

"SUBJECT TO SUCH TERRITORIALE RE-ADJUSTMENTS AS MAY BE FOUND NECESSARY"

میری پیش کردہ اس درستی کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ ہماری تسلیم شدہ اکثریت کے صوبوں بنگال اور پنجاب کو کاٹا اور توڑا جائے، اور اس کا جواز خود میری اس درستی کے الفاظ سے نکالا جائے۔ بہر حال جو پاکستان ۱۹۴۷ء میں بنا وہ، وہ پاکستان نہیں تھا جس کا تصور مولانا مرحوم کی اسکیم کی وجہ سے ابھرا تھا۔ مسلمان صرف لفظ پاکستان نہیں چاہتے تھے، وہ ایسا پاکستان مانگتے تھے جو ہندو، ہندوستان کے مقابلے میں برابر کا طاقت ور ملک ثابت ہو۔

چند غلطیاں :

بدقسمتی سے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء غلطیوں کے سال ثابت ہوئے۔ ان دو سال میں ہم سے شدید غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی سزا ہم بعد کا سارا عرصہ بھگتتے رہے ہیں۔

؎ اب بات سات کروڑ کی کہاں رہی۔ سولہ کروڑ تو ہندوستان کی حکومت قبول کر چکی ہے۔ مسلمانوں کا دعوا ہے کہ وہ بیس۲ کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔

قرارداد لاہور کی غلط تشریح :

پہلی غلطی یہ تھی کہ ہماری قیادت نے ۱۹۴۶ء میں اسمبلی ممبروں کا اجلاس بلا کر جس کو کنونشن کا نام دیا گیا۔ قرارداد لاہور کو نئے معانی کے زیورات سے آراستہ فرما دیا۔ اصلی قرارداد میں "ریاستوں" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی مشرق خواہ مغرب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ وہاں ان کی آزاد ریاستیں STATES قائم ہوں گی۔ کنونشن نے لفظ STATES سے آخر کا "S" نکال دیا اور کہا گیا کہ ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے یہ زائد "S" آگیا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ قرارداد لاہور ۱۹۴۰ء میں پاس ہوئی مگر ۱۹۴۶ء تک کسی نے یہ ٹائپ کی غلطی محسوس کی، نہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی اقدام کیا۔ بعد کی یہ تحریف یا اصلاح آئینی لحاظ سے بھی جائز نہیں تھی۔ اصل قرارداد مرکزی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پاس ہوئی تھی جو مرکزی مسلم لیگ کی سب سے بڑی باڈی تھی۔ اس کی پاس کردہ قرارداد کو "درست" کرنے کا اختیار بھی اسی باڈی کو حاصل تھا نہ کہ اس کے کسی زیردست ادارے کو۔ مرکزی مسلم لیگ سیشن PARENT BODY تھی اور اسمبلی ممبروں کا کنونشن ایک ذیلی SUB ORDINATE BODY تھی۔ یہ اس کی مثال تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں ایک سول کورٹ درستی کرے تو آئینی طور سے صحیح طریقہ صرف یہ تھا کہ مسلم لیگ سیشن کی پاس کردہ قرارداد کی تشریح یا اصلاح بھی مسلم لیگ سیشن سے ہی کروائی جاتی، نہ یہ کہ مسلم لیگ کے واسطے سے منتخب شدہ اسمبلی ممبروں کو اکٹھا کر کے ان سے مرکزی باڈی کے فیصلے میں تحریف کروائی جائے اور مرکزی باڈی اپنی جگہ پر بیٹھی بغلیں جھانکتی رہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے قرارداد لاہور کو مرتب ہوتے دیکھا۔ میں بحیثیت عینی گواہ کہہ سکتا ہوں کہ قرارداد میں STATES لکھا گیا تھا نہ کہ STATES اس وقت ہمارے ذہن میں دو ریاستوں کا تصور کارفرما تھا۔ ایک برصغیر کے مشرق میں اور دوسری برصغیر کے مغرب میں یہ دونوں ریاستیں SOVEREIGN ہوں گی۔ اسلامی ہوں گی اور دونوں طرف سے ہندوستان کی ہندو ریاست کو گھیرے میں لیے ہوتے

ہوں گی۔ چوں کہ یہ دونوں اسلامی ریاستیں اپنی اپنی جگہ پر خود مختار اور خود کفیل ہوں گی، ان کے مابین اندرونی رقابت پیدا ہونے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا وہ ایک دوسرے کو اپنا حریف نہیں سمجھیں گی اور تقسیم مال یا ذرائع پیداوار کی کمی بیشی۔ یا ملازمتوں میں تناسب کے مسئلے پر ان کے مابین کوئی جھگڑا نہیں چھڑے گا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہوں گی۔ ان کی قیادتیں مسلم لیگ سے وابستہ ہونے کی بنا پر آسانی سے ایک دوسرے کے مشورے سے کام کرتی رہیں گی۔ اس وقت کسی کو خواب و خیال تک نہیں تھا کہ یہاں دو کی جگہ ایک ریاست قائم ہو گی جس کی بوتل میں مشرق اور مغرب دونوں کے، حال اور مستقبل کے طالع آزما سیاسی بھوتوں کو یک جا بند کرنے کی کوشش ہو گی۔ اور ہندوستان میں تو کانگریس پچیس سال اپنے صوبوں کے مجموعہ اضداد کو ایک ہی تنظیمی رشتے میں منسلک رکھے مضبوط بیٹھے رہے گی۔ مگر ہمارے یہاں پاکستان قائم ہوتے ہی مسلم لیگ فوت ہو جائے گی، اور اس کے بعد کے متولی یا "لیڈر"، ایسے چابک دست کفن چور ثابت ہوں گے جو دن دھاڑے مسلم لیگ کی لاش پر سے کفن نوچ کر اس کے چیتھڑے بکمال دیدہ دلیری، کھلے بندوں وزارتی اور سفارتی عہدوں کے عوض بیچ بازار بیچتے پھریں گے۔ نہ ان کو شرم دامن گیر ہو گی، نہ جماعت کی پچھلی روایات صالحہ کا احترام ملحوظ رہے گا، نہ یہ خیال مانع ہوگا کہ اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو پاکستان کہاں ہوتا۔ اور ان کو اپنے ایمان اور اصولوں کو اب "بلیک"، میں بیچنے کی یہ سہولتیں کہاں سے بہم پہنچتیں۔؟

بہر نوع جس زمانہ میں قرار داد لاہور مرتب اور منظور ہوئی چند باتوں کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ یعنی یہ کہ :۔

(۱) جو پاکستان بنے گا وہ مولانا غلام رسول مہر کے تجویز کردہ پاکستان سے مختلف ہوگا۔

(۲) مسلمانوں کی مجوزہ دو ریاستوں کی جگہ ایک ریاست قائم ہوگی۔ جن کے مابین ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔ اور جن کے بیچ میں بھارت براجمان رہے گا۔

(۳) ایسا وقت بھی آئے گا جب مسلم لیگ کالعدم ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی سیاسی

تنظیم کی مسلمانی بنیاد منہدم ہو جائے گی۔ ان کا سیاسی شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کے مابین کوئی نظریاتی رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ پاکستان کی سیاست پتنگوں کی لڑائی کا سماں پیش کرے گی، اور جس طرف ہوا کا زور ہوگا سیاست کے پتنگ باز اس کے مطابق ہی اپنا رخ متعین کریں گے۔

(۴) مسلم لیگ پر گھٹیا قسم کے لوگ قبضہ کر لیں گے۔

(۵) وہی عوام جو اس وقت "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" گاتے پھرتے تھے وہ پاکستان بن جانے کے بعد فوراً ہوا و ہوس میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور اپنی محسن جماعت سے آنکھیں پھیر لیں گے۔

غرض یہ سب بعد کے حوادث ہیں۔ قرارداد لاہور کے منظور ہونے کے وقت خواہ ۱۹۴۶ء والے کنونیشن کے موقع تک ان حوادث کے وقوع کا کوئی اندیشہ محسوس نہیں کیا جا رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ کنونیشن سے وہ غلطی سرزد ہوگئی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی اس نے قرارداد لاہور کی نئی شرح کر کے دو ریاستوں کے تخیل کو ایک ریاست میں سمیٹ دیا اور مستقبل کی باہمی کشیدگی کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

ایک بات اس سلسلے میں صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس غلطی کے ارتکاب کی ذمے داری کنونیشن میں حاضر مغربی پاکستان کے نمایندوں پر عاید نہیں ہوتی۔ کیوں کہ نئی تشریح کی کوشش یا ابتدا انھوں نے نہیں کی، بلکہ خود مشرقی پاکستان کے نمایندوں نے کی، اور اس کام میں ان کی قیادت جناب شہید سہروردی مرحوم نے فرمائی جو اس وقت متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے اس طریقے سے "واحد پاکستان" کی ضرورت پر زورِ زبان صرف فرمایا کہ اگر مغربی پاکستان والے ان کے نقطۂ نظر کو قبول نہ کرتے تو وہ وحدت ملی کے دشمن کہلاتے۔ جب مشرقی پاکستان والے خود اپنی زبان سے یہ کہہ رہے ہوں، اور اس بات پر انتہائی اصرار کر رہے ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے تو مغربی پاکستان والوں

کے لیے یہ نامناسب تھا کہ وہ یہ موقف اختیار کریں کہ ہم ان کو اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے۔

البتہ سہروردی مرحوم کو شاید اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان بنتے ہی "غدار سازی" کے کارخانے کھل جائیں گے، اور خود ان کو بھی غدار پاکستان قرار دے کر آئین ساز اسمبلی کی ممبری سے محروم کیا جائے گا۔ اور کافی عرصہ کے لیے ان کو ملک بدر ہونا پڑے گا۔

قصہ مختصر پہلی غلطی یہ تھی کہ قرارداد لاہور کی غلط تشریح کی گئی ــــ"

تقسیم کا غلط اصول :

دوسری اور مہلک غلطی یہ تھی کہ ہم تقسیم ملک کے موقع پر ماؤنٹ بیٹن کے چکر میں آ گئے، اور اس وجہ سے کئی اور غلطیاں کر بیٹھے۔ یعنی :۔

(۱) مولانا مرحوم کی تیار کردہ اسکیم کو، اور مستقبل کے جن خطرات سے انھوں نے خبردار کیا تھا ان کو نظر انداز کر کے ہم نے وہ "پاکستان" منظور کر لیا جو ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں نے مل کر اس مقصد سے تجویز کیا تھا کہ اس سے اصلی پاکستان کی نفی ہو اور مستقبل کے بارے میں ان کے معاندانہ عزائم کی تکمیل کا سامان ہو سکے۔

(۲) ہم اپنی اکثریت والے صوبے بھی کٹوا کر بیٹھ گئے ــــ کلکتہ جیسا مشرق کا مرکز براہِ راست ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔ اور مغرب میں ہم اس قدر دہلی سے دور ہو گئے کہ بھارت کا دارالحکومت ہمارے دباؤ کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا۔ اگر کلکتہ ہمارے پاس رہ جاتا تو کیا بھارت کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ ہمارے مشرقی پاکستان کے بارے میں وہ کھیل کھیلتا جو اس نے حال ہی میں کھیلا؟ اور اگر ہمارا پنجاب کا صوبہ کامل ہمارے پاس رہ جاتا تو کیا ہندوستان اپنے دارالحکومت دہلی کو ہماری زد میں پا کر کبھی ہمارے خلاف جارحیت کی جرأت کرتا ــــ ؟ ہم گوڑگاؤں، یا پانی پت سے نکل کر چند گھنٹوں کے اندر اندر دہلی کا صفایا کر دیتے۔ مگر تقسیم پنجاب قبول کر کے ہم نے اپنا ہاتھ تو بھارت کی گردن میں

سے نکال لیا اور اس کا ہاتھ اپنی گردن (لاہور) میں ڈلوا دیا۔

ماونٹ بیٹن کا انتقام :

ماونٹ بیٹن کو ہم نے چند مہینے کے لیے پاکستان کا گورنر جنرل بننے نہیں دیا۔ وہ عجیب ذہنیت اور خواہشات کا آدمی تھا۔ تاریخ کے ایک چکر نے اس کو اس وقت ایک فیصلہ کن پوزیشن میں بٹھا دیا تھا جس کا وہ فایدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ یہ اعزاز حاصل کرے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کا بہ یک وقت گورنر جنرل رہا، اس نے پہلے کانگریس کے دل کو ٹٹولا اور یہ پایا کہ کانگریس بہ طیب خاطر اس کو آزاد بھارت کا پہلا سربراہ مملکت بنانے کے لیے تیار ہے۔ کانگریس سے مطمئن ہو کر اس نے مسلم لیگ کی طرف رجوع کیا مگر وہاں یہ دیکھا کہ مسلم لیگ والے کسی صورت میں اس کو بطور گورنر جنرل پاکستان قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب اس کے غصے کا پارہ مسلمانوں کے خلاف فوراً "شوٹ" کر گیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے انکار کو اپنی ذاتی توہین پر محمول کرتے ہوئے اس نے بڑے پیمانے پر انتقامی کارروائیوں کا پلان بنا لیا، اور اس کی انتقامی کارروائیوں کے کچھ نتائج یہ برآمد ہوئے :۔

(الف) بنگال اور پنجاب کے صوبوں کو کٹوا دیا گیا۔

(ب) کلکتہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا اور دہلی ہماری زد سے دُور ہو گئی۔

(ج) پاکستان کو زیر بار کرنے کی نیت سے ہندوستان میں مسلمانوں کا کشت و خون شروع کروا کر ان کو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کتنے لاکھ بے گناہ مسلمان اس کشت و خون کے دوران شہید ہوئے یا کتنی ہزار مسلمان خواتین اغوا ہو گئیں، صحیح تعداد آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔

(د) کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا۔

(ھ) حیدر آباد دکن جیسا مسلمانوں کا مرکز فنا ہو گیا۔

(و) PARTITION PLAN کی روح کے خلاف ان ریاستوں پر بھی ہندوستان

سے قبضہ کروایا گیا جو ریاستیں پاکستان سے باقاعدہ الحاق کر چکی تھیں۔

(مثلاً جونا گڑھ)

(ز) "اکھنڈ بھارت" کے تصور کے مطابق، ہندوستان کی جملہ دیسی ریاستوں کو مٹا کر ہندوستان میں مدغم کروا دیا گیا۔

(ح) ریڈکلف ایوارڈ ہمارے خلاف گیا۔

یہ سب نتائج تھے اس غلطی کے کہ ہم چند مہینے کے لیے ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی خواہش کی تکمیل برداشت نہیں کر سکے۔ اگر چار چھ مہینے ہم اِس بلائے بے درماں کا بوجھ برداشت کر لیتے تو یہ حوادث ہرگز پیش نہیں آتے۔ کانگرس والوں نے ان کو چھ مہینے کے لیے گورنر جنرل بنا کر کیا کھویا ــــ؟ بلکہ انھوں نے تو اپنی سب مرادیں پا لیں۔

حد بندی کا اصول:

چوتھی غلطی یہ تھی کہ ہم نے مولانا مہر والی سکیم اور اس کے فوائد کو نظر انداز کر کے نئی حد بندی کا اصول تسلیم کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈکلف صاحب یہاں پہنچ گئے اور انھوں نے جو کچھ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔

ریڈکلف کا تقرر:

پانچویں غلطی یہ تھی کہ ہم نے اس کام کے لیے ریڈکلف کا نام پیش کر دیا۔ اب بعض دستاویزات کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہیں جن سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے۔ کم از کم ہم کو ماؤنٹ بیٹن سے اپنے تعلقات کی نوعیت کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے کسی انگریز کا نام اس کام کے لیے منظور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم کسی غیر انگریز بین الاقوامی شخصیت کو، جو ماؤنٹ بیٹن کے اثر سے بالا ہوتی، اس کام پر لگوا سکتے تھے۔ ہم اصرار کرتے تو یہ ہو جاتا۔ یہ ثالثی کا معاملہ تھا، اور اگر ایک فریق کسی ثالث کو قبول نہ کرے تو کون اس کو مجبور کر سکتا تھا؟

ایک اور غلطی:

چھٹی غلطی یہ تھی کہ ہم نے پیشگی یہ لکھ کر دے دیا کہ ریڈکلف جو فیصلہ فرمائیں گے وہ

آخری ہوگا اور ہم اس کو قبول کرنے کے پابند ہوں گے۔ ہم کو ماؤنٹ بیٹن کی نیت بھانپ کر اپیل کا دروازہ اپنے لیے کھلا چھوڑنا چاہیے تھا۔ مثلاً یو این وجود میں آچکا تھا اور ہم اس سے رجوع کر سکتے تھے۔

ایک مفروضہ :

اس منزل پر اس سوال کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ "کیا ہمارے لیے کوئی ایسا طریقہ تھا کہ ہم یہ غلطیاں نہ کرتے یا ان غلطیوں کے ارتکاب سے بچ جاتے۔

میرا جواب اثبات میں ہوگا۔ یعنی ہمارے لیے بالکل تھا کہ ہم یہ غلطیاں نہ کرتے اور ہم ایسا پاکستان حاصل کر لیتے جو بعد کے تمام خطرات اور مصیبتوں سے بالکل محفوظ رہ جاتا۔

جنگ عظیم دوم کے بعد کے حالات پر ایک نظر :

اولاً جن حالات کے تحت برصغیر کا بٹوارہ ہو رہا تھا، ہم کو ان حالات کو ایک بار پھر اپنے ذہن میں رکھنا ہوگا۔ وہ حالات کیا تھے ؟ حالات یہ تھے۔

(۱) انگریز عالمی لڑائی میں سے ابھی ابھی تباہ و برباد ہو کر نکلا تھا۔ اس کی فوجی قوت اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اس کو ہندوستان کی "سول وار" میں جھونک سکے۔ پہلی عالمی لڑائی کے خاتمے کے فوری بعد انگریز ایسی ہی کمزوری اور تھکاوٹ کی کیفیت میں مبتلا تھا کہ افغانستان نے اس صورت حال کا فایدہ اٹھا کر انگریز کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ اور انگریز مجبور ہو گیا تھا کہ وہ افغانستان کو آزادی اور خراج دے کر اپنی جان چھڑائے۔ اب کی دوسری عالمی لڑائی کے اختتام پر انگریز پر پھر وہی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور اگر اس مرتبہ افغانستان کی طرح ہم بھی اس کا فایدہ اٹھا کر اس کو چیلنج کر دیتے تو وہ ہمارے سامنے بھی جھک جاتا۔ اصل قصور ہماری اپنی بے صبری، اور جلد بازی کا تھا۔ ہم نے یہ سمجھا کہ اگر ہم نے ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس کا فیصلہ نہیں مانا اور ان کا پیش کردہ پاکستان فوراً قبول نہیں کیا تو ہم کو کچھ نہیں ملے گا اور موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ حالاں کہ یہ

ممکن ہی نہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا کوئی نقشہ مسلمانوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر بن سکتا۔

(۲) انگریز کی انڈین آرمی میں بغاوت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ برما فرنٹ پر اس بغاوت نے انڈین نیشنل آرمی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نیوی نے کلکتہ اور بمبئی میں علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ ہوائی بیڑہ پہلے ہی قریب قریب نابود ہو چکا تھا۔ تو ایسے حالات میں انگریز کس طاقت کے بل بوتے پر ہندوؤں کی امداد کرتے ہوئے مسلمانوں سے لڑائی مول لیتا؟ جب اس کو ہندوستان سے جانا ہی تھا تو جاتے جاتے وہ کیوں کسی کی خاطر اپنا خون بہاتا؟

(۳) امریکہ نے اس شرط پر عالمی جنگ میں انگریز کی حمایت کی تھی کہ جنگ میں کامیابی حاصل کر لینے کے فوراً بعد وہ ہندوستان سے نکل جائے گا۔ جنگ ختم ہوتے ہی یہ امریکی دباؤ اس پر بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا اس قسم کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں نے گڑبڑ پیدا کی تو انگریز یہاں رہ جائے گا، اور برصغیر آزاد نہیں ہو سکے گا۔ انگریز کو ہر حال میں یہاں سے جانا تھا اور جلد سے جلد۔

(۴) اس وقت کی برٹش انڈین فوج میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اگر مسلمانانِ ہند، اسلام کے نام پر جہاد کا اعلان کر دیتے تو مسلمان فوج مسلمانوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی اور اس کو نہ انگریز اس وقت روک سکتا، نہ ہندو اس کا مقابلہ کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ تو یہ ہوتا کہ فوج آپس میں لڑ پڑتی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو میدان خالی مل جاتا اور وہ ہندو کو مجبور کر دیتے کہ وہ ان کو وہی پاکستان دے دیں، جو پاکستان مسلمان مانگ رہے تھے۔

(۵) ہندوؤں کی کوئی عسکری تنظیم اس وقت تک موجود نہیں تھی۔ وہ اس قابل قطعاً نہیں تھے کہ وہ لڑنے، مرنے اور مارنے کے معاملے میں مسلمانوں جیسے پیدائشی مجاہدوں کا مقابلہ کر سکیں۔

(۶) ہندوستان کے مسلمان اس وقت سو فیصد متحد اور منظم تھے وہ سب ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے تھے۔ وہ صرف اپنی قیادت کے حکم کے منتظر تھے۔ اگر ان کو حکم مل جاتا تو وہ ایسا طوفان بپا کر دیتے کہ اس کے سامنے نہ انگریز اس وقت کھڑا رہ سکتا، نہ ہندو۔ بہت ممکن تھا کہ وہ دوبارہ سارے ہندوستان پر ہی قابض ہو جاتے کیوں کہ اس وقت دنیا کی جملہ عالمی طاقتیں عالمی جنگ سے نکلنے کے بعد اس قدر تھکاوٹ اور درماندگی کی حالت میں تھیں کہ وہ کسی صورت میں ہندوستان کی سول وار میں مداخلت کر کے محض ہندو کو ہندوستان کا قبضہ دلانے کے لیے اپنی افواج کو قربانی کا بکرا نہ بنواتیں۔

اب یہ تھے مجموعی حالات اس زمانے میں انگریز کے، ہندو کے، مسلمان کے اور ہندوستان کے۔

ایسے حالات میں ہم کو تھوڑی ہمت دکھانے کی ضرورت تھی اور ہم کو کرنا یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنی بنائی ہوئی پاکستان اسکیم پر اڑ جاتے، اور انگریز خواہ ہندو سے صاف صاف کہہ دیتے کہ:

"ہم یہ پاکستان چاہتے ہیں، اگر دیتے ہو تو شکریہ، ورنہ ع
من وگرز و میدان و افراسیاب
ہم لولا لنگڑا پاکستان قبول نہیں کریں گے۔ ہم ایسا پاکستان منظور نہیں کریں گے جس کا کوئی موثر دفاع نہ ہو سکے، اور جس کو تم بعد میں آسانی سے پارہ پارہ کر کے ہضم کر جاؤ۔"

خوب و ناخوب:

اگر ہم اس فیصلہ کن مرحلے پر صرف اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دیتے، اور ماؤنٹ بیٹن یا ہندوؤں کے ہاتھوں کوئی جوڑ توڑ منظور نہ کرتے تو ماؤنٹ بیٹن اور ہندوؤں کے بلف BLUFF کا بھانڈا اسی وقت پھوٹ جاتا اور وہ ہم کو مکمل پاکستان دے کر ہی اٹھتے۔ ان میں اس وقت اتنا دم ہی نہیں تھا کہ وہ ہمارا مطالبہ رد کر کے ایسی "سول وار" کا خطرہ

مول لیتے جس کی آگ میں سارا ہندوستان جل جاتا۔ نہ ہندو اتنا بے وقوف تھا نہ انگریز اس قدر کوتاہ اندیش ۔صرف ان کو یہ یقین ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان اپنی اسکیم پر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اور مکمل پاکستان سے کم کوئی چیز نہیں قبول کرے گا۔

بفرض محال اگر یہ طریقہ کامیاب ثابت بھی نہ ہوتا اور واقعی سول وار شروع ہوجاتی، تو اس صورت میں بھی مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان اتنا نہیں ہوتا جتنا نقصان انھوں نے ماونٹ بیٹن اور پٹیل کے تجویز کردہ پاکستان کو قبول کرکے اٹھایا، اٹھا رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔

نقصانات پر ایک نظر:

اب تک کے نقصان کا تخمینہ تو کیجیے :-

(۱) کتنے لاکھ مسلمان ۱۹۴۷ء اور بعد کے فسادات میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ۔؟

(۲) کتنی ہزار عورتیں اغوا ہوئیں جن کی فہرست ہم ایک عرصہ تک اخبارات میں چھپواتے رہے ؟

(۳) کتنے لاکھ مسلمان بے خانماں ہوکر پاکستان پہنچے اور یہاں پہنچنے کے بعد اب تک ان میں سے بہتوں کو کامل اطمینان نصیب نہیں ہوا ہے ۔

(۴) ہندوستان میں چھوڑی ہوئی کتنی جائداد (مسلمانوں کی) تباہ ہوگئی ؟

(۵) تقسیم کے بعد اب تک تین بار ہندوستان اور پاکستان کے مابین لڑائیاں ہو چکی ہیں جن کی وجہ سے کتنا جانی و مالی نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا ۔؟

(۶) حال ہی کے المیے میں مشرقی پاکستان میں کتنے لاکھ مسلمان مرے ؟ ان اموات کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟ یہ واقعات کس کی شہ اور دخل اندازی کی وجہ سے رونما ہوئے مارا کسی نے بھی کسی کو ـــ مگر مرنے والے تو دونوں طرف سے مسلمان ہی تھے۔

(۷) ایک لاکھ کے قریب پاکستان کی فوج ہندوستان کی قید میں گئی، اسلحہ کا نقصان

اس کے علاوہ ہوا۔
(۸) مزید سات کروڑ کے قریب مسلمان دوبارہ ہندو کے رحم و کرم پر رہ گئے۔
(۹) خبر نہیں اب ہندوستان ہم سے کیا نئی شرطیں منوائے گا۔
(۱۰) ہم پر دفاعی خرچ کا اتنا بوجھ رہتا ہے کہ ہم مقروض ہو گئے ہیں۔
میں پوچھتا ہوں کہ اگر ۱۹۴۷ء میں "سول وار" ہو جاتی تو کیا مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ؟

ہند کے محکمہ خارجہ کی ایک رپورٹ :

مزید ایک شاخسانہ اپنی غلطیوں کا بھی ملاحظہ کر لیجیے جو میں بطور ایک مثال کے پیش کر رہا ہوں :۔

یہ رپورٹ بھارت کی وزارت خارجہ کی جاری کردہ ہے جو اسی مہینے یعنی ۲۲ اپریل ۱۹۷۲ء کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور جس کے معانی اور مضمرات کو سمجھنے کی ہم کو شاید فرصت ہی نہیں ملی۔

خبر کا متن یہ ہے :

"نئی دہلی ۲۱ر اپریل۔ ہندوستان باور کرتا ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام نے دو قوموں والے نظریہ کے پھوڑے کو ہمیشہ کے لیے پھوڑ دیا ہے۔ یہی دو قوموں والا نظریہ تھا جو باعث بنا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے الگ الگ ملکوں کے قیام کا۔

"ہندوستان کی وزارت خارجہ کی طرف سے کل ہی ایک رپورٹ بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں سرکاری طور پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ دو قومی نظریہ یعنی برصغیر کے امن اور آشتی میں رخنہ اندازی کا باعث بنا تھا۔ اور اب چونکہ یہ تھیوری مسمار ہو چکی ہے تو ہندوستان کی نظروں میں اب ہندوستان اور پاکستان کے مابین تعلقات کے معمول پر آنے اور صلح اور دوستی کے قائم ہو لے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

"رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے قائم ہونے سے یہ تصور ختم ہو گیا ہے کہ

ریاستیں مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہیں ۔" (رائٹر نیوز ایجنسی)

ہماری بے حسی :

الفاظ پر غور کیجیے! ہندوستان قضیہ مشرقی پاکستان کو اب کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے ؟ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے ۔ اور دنیا کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے ۔ کہ دو قوموں والا نظریہ جس پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی اب غلط ثابت ہو چکا ہے، اور ختم ہو چکا ہے ۔

اس کے معنی کیا ہوتے ہیں ؟ اس سے کس نیت کی نشان دہی ہو رہی ہے ؟ اس سلسلے میں ہندوستان کا دوسرا قدم کیا ہو سکتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان دنیا سے یہ موقف منوا لے کہ دو قدموں والا نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور ختم ہو چکا ہے تو پھر باقی پاکستان یعنی مغربی پاکستان کے ہندوستان سے الگ بطور ریاست قائم رہنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے ؟ جب کہ پاکستان کی بنیاد دو قوموں والے نظریے پر تھی، اور اس اصول پر کہ مذہب اسلام کے پیروؤں کے لیے الگ ریاست ہونی چاہیے ۔ ؟

اساسی اصول کے انہدام کے بعد مشرقی یورپ کی بالٹک ریاستیں کتنا عرصہ آزاد رہ سکی تھیں ۔ ؟

بہر حال میری اس گذارش کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ ہماری ابتدائی غلطیوں کے کیا نتائج نکلتے رہے ہیں ۔ اور اب تک نکل رہے ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارا سیاسی کردار :

اوپر کی بحث سے میں نے اپنی تاریخ کے دو ادوار کی غلطیوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یعنی ان غلطیوں کی جو ہم نے (۱) پاکستان بننے سے پہلے کیں اور (۲) پاکستان بننے کے وقت کیں ۔

اب آخر میں ان غلطیوں کی طرف اشارہ کروں گا جو پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کا کاروبار چلانے کے سلسلہ میں ہم سے سرزد ہوتی رہیں، اور جن کا خمیازہ ہم سارا

وقت بھگتتے رہے ہیں :۔

(۱) پاکستان قائم ہوتے ہی شخصیت پرستی بہ طریق بت پرستی ہماری فطرت ثانیہ بن گئی۔ ہم کو ہر دور میں ایک بت کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی تاکہ ہم اس کے سامنے جھکتے رہیں اور اس کو پوجتے رہیں۔ یہ بت ہم خود ہی بناتے اور خود ہی بعد میں توڑتے رہے مگر جب تک ایک بت قائم رہا ہم اس کی پوجا کرتے رہے

(۲) ہماری شخصیت پرستی یا بت پرستی کی عادت نے آگے چل کر ہمارے یہاں "شخصی حکومت" کے تخیل کو جنم دیا اور جس تناسب سے "شخصی حکومت" کا تخیل اجاگر ہوتا گیا اسی تناسب سے جمہوریت کا تصور ماند پڑتا گیا۔ "فرد" کی شخصیت اور اس کے حقوق کا احترام جمہوریت کی روح ہوتا ہے مگر شخصی حکومتوں کے تحت پہلے فرد کی شخصیت معدوم ہو جاتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہی جمہوریت غائب ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی یہ کیفیت رہی۔

(۳) ۱۹۵۶ تک ہمارے یہاں کوئی آئین نہیں بن سکا، وجہ تاخیر یہ تھی کہ وقت کا ہر حکمراں یہ چاہتا تھا کہ پہلے اس کی اپنی شخصی حکومت اور ذاتی اقتدار کا تصور ملک پر جم جائے تاکہ اسی تصور کے سانچے میں بعد میں، آئین کو بھی ڈھالا جائے اور اپنی شخصی حکومت کو اس آئین کے ذریعے دوامیت بخشی جا سکے۔ مگر درانحالیکہ یہاں کے کسی حکمراں کو دست قدرت نے کوئی طویل مہلت عطا نہیں کی اور وہ، یکے بعد دیگرے جلد جلد گرتے رہے۔ لہٰذا آئین سازی کی نوبت ہی نہیں آئی اور یہ کام ملتوی ہوتا رہا۔

(۴) اس اثنا میں ہمارے یہاں "غدار سازی کی صنعت" چالو" ہو گئی۔ وقت کے ہر حکمراں نے "غدار سازی" کا ایک کارخانہ کھولے رکھا، اور وہ اپنے ہر سیاسی حریف کو "قوم کا غدار" اور "پاکستان کا دشمن" قرار دیتا رہا۔ انتہا یہ ہوئی کہ کچھ عرصے کے بعد جب نظر پھرا کر دیکھا گیا تو یہ پایا گیا کہ پاکستان کا کوئی لیڈر

یا سیاسی ورکر ایسا نہیں رہا تھا جو کسی نہ کسی دور میں اس لقب سے نوازا نہ گیا ہو۔ حتیٰ کہ شیرِ بنگال مولوی فضل الحق مرحوم جنھوں نے قرار داد لاہور پیش کی تھی، اور جناب حسین شہید سہروردی مرحوم جنھوں نے ۱۹۴۶ء والے کنونشن میں قرار داد لاہور کی یہ تاویل پیش کی تھی کہ اس سے مراد ایک متحد پاکستان کا قیام تھا۔ اور اسی تاویل کی بنا پر بنگال کو بھی مغربی پاکستان کے ساتھ شامل کیا گیا، ایک وقت وہ بھی غداروں کی صف میں کھڑے کر دیے گئے تھے۔

(۵) ۱۹۵۶ء میں خدا خدا کر کے اور وہ بھی بطور ایک ایکسیڈنٹ کے ایک ایسا جمہوری آئین بن گیا جس کے بنانے میں اس دور کے بڑے بڑے بزرگوں نے حصہ لیا، اور جس سے بہتر آئین بننا ہرگز ممکن نہیں۔ مگر چوں کہ یہ آئین شخصی حکومت کے تصور سے متصادم تھا۔ لہٰذا وقت کے حکمران سکندر مرزا مرحوم نے اپنے شخصی حکومت کے خواب کو پریشان ہوتے دیکھ کر اس آئین کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اور دو سال کے اندر وہ اس مقصد شنیعہ کے حصول میں کامیاب ہو گیا۔ اور کئی سیاست دانوں نے اس منصوبے کی کامیابی کے لیے مرزا مرحوم سے شرکت مجرمانہ کر کے اپنے اور اپنی قوم کے لیے خسر الدنیا والآخرۃ کا سامان کر دیا۔

(۶) ری پبلکن پارٹی قائم کر کے مسلم لیگ کے رشتے کو جس میں ساری قوم پچاس سال سے منسلک رہی تھی تڑوا دیا گیا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین کوئی نیا جماعتی، تنظیمی، اور نظریاتی رشتہ نہ قائم رہ سکا نہ قائم ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے دونوں بازو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔

(۷) ۱۹۵۸ء سے مارشل لاء اور شخصی حکومتوں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ جمہوریت غائب۔ بنیادی انسانی حقوق سلب اور قانون کا راج۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ لوگوں نے دیکھ لیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انسانی آزادی اور جمہوریت دونوں

کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ بعض فوجی جرنیلوں کی اخلاقی کمزوریاں اس پر مستزاد اور ہماری بہادر افواج کے مورال پر اس کا اثر معاذاللہ!

(۸) شخصی حکومتوں کے زمانے میں درباری ماحول کا قیام ناگزیر تھا اور جہاں درباری ماحول ہوتا ہے وہاں رشوت خوری، اور مال و دولت جمع کرنے کی خواہش پر کنٹرول نہیں رہتا۔ یہی حشر ہمارا ہوا۔

(۹) رشوت خوری اور جلبِ زر کے مرض کا علاج بعد میں یہ تجویز کیا گیا کہ سرکاری ملازمتوں کو آئینی دفاع اور ضابطہ ملازمت کی پروٹیکشن PROTECTION سے محروم کیا جائے اور سرکاری ملازمتوں کو غیر یقینی اور غیر مستقل بنا دیا جائے تاکہ کوئی افسر سیاسی اثرات سے محفوظ نہ رہ کر اور بے خطر ہو کر انصاف نہ کر سکے۔ یعنی علاج مرض سے بدتر۔

(۱۰) ہر مارشل لا یا آرڈی ننس کی ابتدا اور انتہا اس نادری حکم پر ہونے لگی کہ عدالتوں کا اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ یعنی ہر اہم معاملے میں عدلیہ مفلوج!

(۱۱) مشرقی پاکستان کے عوام کی مزاجی کیفیات اور ان کی ماضی کی سیاسی تاریخ کی خصوصیات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور ان کو بھی مغربی پاکستان کے عوام کے ساتھ ساتھ آمریت کی ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش ہوتی رہی۔ حالاں کہ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام سیاسی شعور اور جمہوری جذبے کی گہرائی کے لحاظ سے ہم سے مختلف تھے، اور جمہوریت کے بغیر مارشل لا شخصی حکومتوں کے تحت ان کا مطمئن رہنا اسی طرح ناممکن تھا جس طرح پانی کے بغیر مچھلی کا زندہ رہنا۔ ہوا یہ کہ جمہوریت سے محروم ہو جانے کے بعد پاکستان سے ان کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔

(۱۲) جتنا عرصہ بنگالی بھائی ہم سے وابستہ رہے ان کو ہم سے اس کے علاوہ بھی کئی شکایتیں رہیں جن کا ہم اپنی کم عقلی، تنگ دلی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے کوئی ازالہ نہیں کر سکے۔ ہم کو کم از کم اب تو سچی اور ایمان کی باتیں مان لینی چاہییں۔

(۱۳) نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بغاوت کر دی، اور ہمارے جرنیل صاحبان نے بغیر سوچے سمجھے فوجی ایکشن لے لیا۔ "فوائد" چار برآمد ہوئے۔

(الف) لاکھوں مسلمان شہید ہو گئے۔ (اکثر مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں)۔

(ب) پاکستان اپنا مشرقی بازو کھو بیٹھا۔

(ج) ایک لاکھ مسلمان فوج کو جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار پھینک کر اپنے کو مقید کرانا پڑا اور۔

(د) واویلا کرنے اور اپنا سر پیٹنے کے لیے ہم مغربی پاکستان والے رہ گئے۔

(۱۴) اور اب ہندوستان دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مشرقی پاکستان ٹوٹ جانے کے بعد سرے سے نظریۂ پاکستان ہی ختم ہو چکا ہے۔ دو قوموں والی تھیوری غلط ثابت ہو گئی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر ریاستوں کی تعمیر کا اصول ایک لغویت سے زیادہ نہیں رہا۔ اس سے ہندوستان کا مقصد کیا ہے؟ اس کے بارے میں اپنا ناچیز خیال اوپر پیش کر چکا ہوں۔

قصہ مختصر یہ ہے ہماری غلطیوں کا طومار، جن کی ابتدا اس روز ہوئی جس روز ہم نے مولانا غلام رسول مہر کی تیار کردہ پاکستان اسکیم کو بالائے طاق رکھ دیا اور ہم ماونٹ بیٹن اور کانگریس والوں کے فریب میں آ گئے۔ ع

یک لحہ غافل گشتم وصد سال راہم دور شد

لمحۂ فکریہ:

اب ۱۹۴۶ء اور بعد کے واقعات پر کافی تاریخی لٹریچر ہندوستان، پاکستان، یورپ اور امریکہ میں شائع ہو چکا ہے۔ کاش کوئی شخص اس تمام مواد کو سامنے رکھ کر ہماری تاریخ کے نشیب و فراز کی مکمل تصویر تیار کر کے ہماری نئی نسل کے سامنے لے آئے۔ یہ کہانی سبق آموز ہو گی ہم کو اپنی پچھلی غلطیاں معلوم ہو جائیں گی، اور ہم آیندہ ایسی غلطیوں کے اعادے سے گریز کریں گے اور یہ بات پاکستان کی، سالمیت اور استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے بے انتہا مفید ثابت ہو گی۔ ایک جاہل اور ماضی سے بے خبر ملکی کارکن سے ایک باخبر ملکی کارکن زیادہ کار آمد ثابت ہوتا ہے۔

(۸ مئی ۱۹۷۲ء)

باب ہشتم :

مولانا مہر کی ڈپلومیسی کی چند جھلکیاں

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نہ صرف اعلیٰ پایے کے سیاسی مفکر تھے بلکہ وہ بے مثل "ڈپلومیٹ" بھی تھے، میں نے ان کی اعلیٰ ڈپلومیسی کے مظاہرے کئی بار دیکھے۔ پہلے کامیاب ڈپلومیسی کے لوازمات ذہن میں رکھ لیجیے : ڈپلومیٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب کسی کے سامنے پیش ہو تو اس کے چہرے، بشرے، انداز گفتگو اور نشست و برخاست سے یہ تاثر پیدا ہو کہ وہ اپنی جگہ پر ایک باوقار اور سنجیدہ انسان ہے۔ شعبدہ باز اور عیّار نہیں ہے۔ جو لفظ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ بامعنی ہے اور نپا تلا، وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مقصد بیان کر سکتا ہے۔ وہ اس قدر تیز فہم اور ذہین ہے کہ دوران گفتگو ہر بات کی تہ تک فوراً پہنچ سکتا ہے، اور محض لفاظی یا حسن بیان سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا، اس میں اس قدر اہلیت ہے کہ وہ خود تلخ سے تلخ حقیقت شیریں سے شیریں الفاظ میں پیش کر سکتا ہے۔ جن معاملات پر گفتگو کر رہا ہے ان کے جملہ پہلوؤں پر اس کو غیر معمولی عبور حاصل ہے، وہ ذاتی طور پر فریق ثانی کا بدخواہ نہیں ہے، جو نقطۂ نگاہ وہ سامنے لانا چاہتا ہے اس کے پیچھے صداقت اور جذبۂ خیر سگالی کار فرما رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

غرض ڈپلومیسی کا میدان جنگ کے میدان سے کم خطرناک نہیں ہوتا ہے۔ جنگ کے میدان میں انسان ہاتھوں سے لڑتا ہے۔ ڈپلومیسی کے میدان میں انسان عقل سے لڑتا ہے۔ ہاتھ کی غلطیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ عقل کی کوتاہیوں کا کوئی علاج نہیں۔ عالمی سیاست میں انگریز نے شمشیر سے زیادہ ڈپلومیسی سے کامیابیاں حاصل کیں۔ مقابلتاً

لہ مولانا مہر مرحوم نے مصر کا یہ سفر اپریل ۱۹۵۲ء میں کیا تھا۔ مصر کے علاوہ لبنان، اردن اور شام بھی تشریف لے گئے تھے۔ مئی میں وطن واپسی ہوئی تھی۔

جرمن قوم کی شمشیر قوی مگر ڈپلومیسی کمزور رہی، اس وجہ سے ہر امتحان میں شکست کھائی۔

علی ماہر پاشا :

علی ماہر پاشا مصر کا چوٹی کا ڈپلومیٹ تھا۔ شاہ فاروق مرحوم کے دور میں بادشاہ بین الاقوامی سیاست کے بارے میں اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ فاروق فوجی انقلاب کی زد میں آگیا، اور نجیب اور ناصر کا راج قائم ہوا۔ تو علی ماہر کو مصر کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ یعنی اس کی ڈپلومیسی کا یہ عالم رہا کہ فاروق کو بھی اس کی ذات پر اعتماد تھا، اور فاروق کو نکالنے والے فوجیوں نے بھی اس کو قابل اعتماد سمجھا اور اس کو وزارت عظمیٰ کی گدی پر بٹھانا پڑا۔

چودھری خلیق الزمان اور شعوب اسلامیہ :

ہمارے یہاں اس زمانے میں جناب چودھری خلیق الزماں صاحب تحریک شعوب اسلامیہ چلا رہے تھے۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں کے مسلمان عوام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ بدقسمتی سے مصر والے پاکستان بنتے ہی اس کو اپنا رقیب سمجھنے لگے تھے۔ ان کے ذہن میں کسی طرح یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اسلامی دنیا کی قیادت کا مستحق تنہا مصر ہے۔ اور پاکستان اس کو اس اعزاز سے محروم کرنا چاہے گا۔ شاہ فاروق جو اس زمانے میں پادشاہ مصر تھے۔ خلیفۃ المسلمین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ بریں بنا جو تحریک پاکستان سے چلتی تھی وہ اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

مصر کو وفد :

چودھری صاحب نے شعوب اسلامیہ کی کانفرنس کراچی میں بلائی، اور مولانا مہر اور مجھ سے کہا کہ ہم فوراً مصر پہنچ کر مصریوں کا ایک وفد کانفرنس میں شرکت کے لیے لے آئیں۔ ہم دو کے علاوہ انھوں نے مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم، سردار ظفر اللہ خان مرحوم لاہوری، اور ایک اور صاحب کو جن کا اسم گرامی مجھے اب یاد نہیں رہا۔ اس ڈیلیگیشن میں شامل کر دیا۔

مصر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ فاروق پاکستان کی ہر تحریک کا مخالف ہے۔ وہ

کسی مصری کو اجازت نہیں دے گا کہ وہ پاکستان کی بلائی ہوئی کسی کانفرنس میں شرکت کر سکے۔ فاروق کو صرف علی ماہر پاشا ہی اس موقف سے ہٹا سکتا ہے۔ مگر علی ماہر خود ایک ایسا شرانٹ ڈپلومیٹ ہے کہ وہ باتوں ہی باتوں میں لوگوں کو ٹال دیتا ہے۔

علی ماہر سے مولانا مہر کی ملاقات:

مولانا مہر نے فیصلہ کیا کہ اس بلائے بے درماں سے وہ نمٹنے کی خود کوشش کریں گے۔ چنانچہ ٹیلیفون پر ملاقات کے لیے ٹائم لیا گیا۔ مقررہ وقت پر میں اور مولانا علی ماہر صاحب کے دفتر میں پہنچے۔ دفتر کی سجاوٹ ایک فرنچ محل جیسی تھی۔ اعلیٰ قسم کے قالین۔ ہیرپڈ۔ فرنیچر۔ وٹینا کے کرسٹل۔ شینڈ لیئر۔ یورپ کے مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر۔ چینی ساخت کے نایاب گل دان، غرض ہر چیز نظر فریب۔ ہر چیز میوزیم میں رکھنے کے قابل — یہ علی ماہر کی کمپنی کا دفتر تھا۔ اس وقت اس کو کوئی آفیشل پوزیشن حاصل نہیں تھی۔ وہ بادشاہ کا نجی اور ذاتی مشیر تھا۔ بہ حیثیت مدبّر و دانشور البتہ ہر شخص اس کو مانتا تھا۔ اور ہر شخص پر اس کا رعب طاری رہتا تھا۔

ہم ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ مولانا آگے میں ان کے پیچھے، تو اس نے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کو دیکھ کر ہم کو ہندوستان کے خشک مزاج انگریز گورنر اور وائسرائے یاد آگئے۔ مولانا نے اپنا تعارف کرایا، اور اس انداز سے کہ گویا مولانا پر علی ماہر کی بڑائی کا کوئی خاص رعب نہیں ہے۔ اور وہ بطور مصر کے دوست، نہ کہ بحیثیت ملتجی اس کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ پہلے انھوں نے یہ کوشش کی کہ علی ماہر کو بے تکلف باتیں کرنے پر آمادہ کریں۔ کچھ مصر کے ماضی کی باتیں کیں۔ بعض ایسے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا۔ جن سے ماہر کا ذاتی واسطہ رہا تھا۔ اس زمانے میں انگریز اور مصر میں چلی ہوئی تھی۔ مصری چاہتے تھے کہ سوئز کے علاقے سے انگریز اپنا فوجی اڈہ اٹھالیں اور انگریز اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مولانا نے اس مسئلے کے بارے میں بھی عالمی سیاست کے سیاق و سباق میں اس انداز سے اپنے خیالات پیش کیے کہ علی ماہر نے محسوس کر لیا کہ وہ بین الاقوامی سیاست ان سے بہتر جانتے ہیں۔ اور مصر کے

مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد علی ماہر کی شیخی نرم پڑ گئی۔ اس نے اپنی ترکی ٹوپی سر پر سے اتار کر ٹیبل پر رکھ دی۔ پہلے وہ اکڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ قہوہ منگایا سگریٹ پیش کی اور بیکایک ہنس مکھ بن گیا۔ بیس منٹ کے بعد علی ماہر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ مولانا کے سامنے اپنے کو عالمی سیاست کا ایک طالب علم سمجھنے لگا۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے علی ماہر کو ہرگز یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ اس کو عمدًا اور خواہ مخواہ متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا ان پر اپنے علمی تبحر کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔ ساری گفتگو Casual انداز میں ہوتی رہی۔ الفاظ کم سے کم استعمال ہوئے۔ اور مولانا کی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا رہا کہ ان کو مصر سے بہ حیثیت ایک مسلمان ریاست محبت ضرور ہے۔ مگر وہ نہ مصر سے، نہ مصر کے بادشاہ سے، نہ خود علی ماہر کی شخصیت سے کسی طرح مرعوب ہیں۔ اس وقت مولانا گویا اپنے کو پاکستان کا سفیر سمجھ رہے تھے، اور وہ دکھانا چاہتے تھے کہ پاکستان مصر کا ہمدرد بھائی ہے نہ کہ اس کا محتاج ـــ اور یہ بھی کہ پاکستان میں ایسے دانشور بھی موجود ہیں۔ جو مصر کے مسائل کو مصریوں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

آخر میں مطلب کی بات آئی۔ مولانا نے علی ماہر کو دعوت دی کہ وہ خود کراچی کانفرنس میں شرکت کرے۔ اس سے مصر کا بھلا ہوگا۔ مصر کے بادشاہ کی پوزیشن اسلامی دنیا میں مستحکم ہوگی۔ مگر مولانا کے منہ سے دعوت کے الفاظ نکلے۔ اس سے بہت پہلے علی ماہر کی شیخی پگھلی، اور مزاج کی کرختگی رفع ہو چکی تھی۔ مولانا نے ایک لفظ اس سے نہیں کہا کہ وہ بادشاہ سے اس بارے میں بات کریں بلکہ اس کو یہ تک محسوس ہونے نہیں دیا کہ ان کو معلوم ہے کہ وہ بادشاہ کا ذاتی مشیر ہے۔ علی ماہر نے خود سوال کیا کہ "کیا آپ بادشاہ سے ملاقات کرنا چاہیں گے۔؟ مولانا نے جھٹ سے جواب دے دیا کہ "ہم بادشاہ کو بیچ میں لانا نہیں چاہتے۔ ہماری تحریک ایک غیر سرکاری تحریک ہے۔ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس کا زیادہ سے زیادہ فایدہ مصر کو پہنچے، اور بادشاہ کی خدمت ہو۔ مگر براہ راست بادشاہ سے ہمارے ملنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریز خبردار ہو جائے گا

اور وہ اپنی ریشہ دوانیاں شروع کر دے گا۔ جو بات مصر یا بادشاہ کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو گی۔ جو کام بہتر طریقہ سے بالواسطہ انجام پا سکتا ہے۔ اس کو براہ راست کر کے خواہ مخواہ خطرہ کیوں مول لیا جائے؟ وغیرہ وغیرہ

علی ماہر نے وعدہ کر لیا کہ وہ خود بھی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کرے گا، اور دوسرے مصریوں کے کراچی جانے کے لیے بھی سہولت اور اجازت فراہم کرنے میں مدد دے گا۔ وہ اب مولانا کو رخصت کرنے کے لیے موٹر تک آیا۔ موٹر کا دروازہ خود کھولا اور مولانا کو بٹھایا۔ اور مولانا سے درخواست کی کہ "یہ تعلق یہاں پر ختم نہیں ہونا چاہیے۔"

ہم واپس سمیرامس ہوٹل پہنچے تو مولانا نے مجھ سے کہا کہ "اپنے وعدہ کے مطابق علی ماہر خود تو کراچی نہیں چلے گا۔ مگر یہ بات اب یقینی ہے کہ دوسرے مصریوں کے لیے راستہ کھل جائے گا۔ چنانچہ بعد میں وہی ہوا۔ علی ماہر خود نہیں آیا۔ مگر دوسرے بہت سارے مصری مندوب کراچی پہنچ گئے۔ بادشاہ نے خود کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر مصری نمایندے کانفرنس میں شرکت کریں۔

شعوب اسلامیہ کی ناکامی:

بدقسمتی سے چودھری خلیق الزماں کی یہ تحریک زیادہ وقت نہیں چل سکی مگر اس میں نہ چودھری صاحب کا قصور تھا نہ شعوب اسلامیہ کا۔ پاکستان کے بعض اپنے حکمران نہیں چاہتے تھے کہ چودھری صاحب کی لیڈری فروغ پذیر ہو۔ یہ اندرونی رقابتوں کا مسئلہ تھا۔ اگر پاکستان اس وقت ڈٹ کر اپنے سارے ذرائع عالمی اسلامی برادری کو اکٹھا کرنے پر لگا دیتا، اور یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو آج ہمارا یہ حال نہ ہوا ہوتا۔ کم از کم ہندوستان کو یہ کہنے کا حوصلہ ہرگز نہ ہوتا کہ مسلمان ایک علاحدہ قوم نہیں ہیں یا ان کا مذہب اس قدر پھس پھسا ہے کہ اس کی بنیاد پر ریاستیں نہ بن سکتی ہیں نہ قائم رہ سکتی ہیں۔ اگر ہندوستان اس قسم کے ژاژ خائی کی کبھی کوشش بھی کرتا تو دنیا کی مسلمان ریاستوں کے عوام اپنی اجتماعی قوت سے فوراً اس کا دماغ درست کر

دیتے۔

مولانا مہر کی ڈپلومیسی کا ایک اور مظاہرہ:

ایک اور واقعہ سن لیجیے:

پاکستان تحریک کا ابتدائی زمانہ تھا۔ مولانا مہر پاکستان اسکیم مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں وہ زیادہ وقت دہلی میں بسر کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی ان کو بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ بھی جانا پڑتا تھا۔ لوگوں سے ملنے اور ان کے خیالات معلوم کرنے کے لیے۔

ایک منزل پر حیدر آباد دکن کے مستقبل کا مسئلہ زیر غور آیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال کارفرما ہوا کہ اگر حیدر آباد پاکستان تحریک کو چلانے کے لیے کچھ امداد دے تو مالی مشکلات کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک سارا خرچ عبداللہ ہارون مرحوم برداشت کرتے رہے تھے۔

تجویز ہوئی کہ کمیٹی کا ایک وفد سر اکبر حیدری مرحوم، صالح حیدری کے والد صدر اعظم حیدر آباد سے مل کر اس بارے میں ان سے تبادلۂ خیالات کرے۔ ملاقات کے لیے بمبئی جانا پڑا۔ اس سلسلے میں دو رکاوٹیں درپیش تھیں۔ ایک یہ کہ قائد اعظمؒ سے اکبر حیدری سے ملنے کے بارے میں اجازت حاصل کی جائے۔ دوسری یہ کہ سر اکبر حیدری کو، بذریعہ گفتگو" نظریہ پاکستان کی صحت کا قایل کیا جائے۔ دونوں رکاوٹیں کافی بھاری تھیں۔ قائد اعظمؒ سر اکبر حیدری اور اعلیٰ حضرت نظام سے بعض وجوہات کی بنا پر شاکی تھے۔ اور پھر چندہ مانگنے کا سوال بھی درمیان میں تھا۔ جس کے وہ اصولاً مخالف ہوتے تھے۔ ادھر سر اکبر حیدری طبعاً و عملاً انگریز کے وفادار افسر تھے۔ اور انگریز اس زمانے میں مطالبہ پاکستان کو ایک مذاق سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں سر اکبر بیوروکریسی اور ڈپلومیسی کی اعلیٰ ترین خصوصیتوں کے نمایندہ سمجھے جاتے تھے۔ ساری زندگی انگریز کے رفیق کار رہے تھے، اور اس سے فن ڈپلومیسی کی جملہ گھاتیں سیکھی ہوئی تھیں۔ چہرہ سے کسی چیز کا پتا نہیں چلتا تھا۔ سارے طوفان اندر اندر ہی دبے رہتے تھے۔ ان

کے ہمعصر بڑے بڑے لوگ ان سے خائف اور مرعوب رہتے تھے۔ انگریز نے ان کو بطور چوکیدار حیدر آباد میں بٹھایا ہوا تھا۔ وہائٹ ہال کی پالیسی ان کی پالیسی ہوتی تھی۔

سر عبداللہ ہارون ذاتی طور پر بھی ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ مگر اب مجبوری کا معاملہ تھا۔ چندے کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا جتنا حیدر آباد کے مستقبل کا۔ حیدر آباد کے ساتھی، ڈاکٹر سید عبداللطیف وغیرہ مُصر تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے جو بھی اسکیم بنے اس میں حیدر آباد کا خیال ضرور رکھا جائے۔ اس سلسلے میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر سَر اکبر کو رام کرلیا جائے تو نہ صرف اعلیٰ حضرت نظام بلکہ کسی حد تک انگریز بھی ہمارے موقف پر ہمدردانہ غور کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

غرض اس مقصد سے سَر عبداللہ ہارون مرحوم، کراچی سے بمبئی تشریف لے گئے۔ مَیں لاہور گیا۔ اور وہاں سے مولانا مہر مرحوم اور محبوب قریشی مرحوم کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچا ڈاکٹر عبداللطیف اور دوسرے حیدر آبادی کارکنوں کی کوششوں سے سر اکبر حیدری وفد سے ملنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ خبر ہم کو کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے ہی مل گئی تھی۔

بمبئی کے میجسٹک ہوٹل میں جہاں سَر عبداللہ ہارون مرحوم اقامت پذیر تھے، ہماری پہلی میٹنگ ہوئی۔ یعنی سر صاحب مرحوم، مولانا مہر مرحوم، محبوب قریشی مرحوم، ڈاکٹر عبداللطیف مرحوم اور میں نے مل کر قائد اعظمؒ سے اجازت حاصل کرنے اور سر اکبر حیدری کو Tackle کرنے کے لیے حکمتِ عملی مرتب کی۔ طے یہ ہوا کہ قائد اعظمؒ، اور بعد میں سر اکبر حیدری کے سامنے ہمارا مقصد مولانا مہر بیان کریں گے۔ سر عبداللہ ہارون اور باقی لوگ حسبِ ضرورت ان کی تائید کرتے رہیں گے۔

قائد اعظمؒ سے ملاقات:

قائد اعظمؒ سے ملاقات کے لیے ٹائم لے کر ہم "ملبار" ہل پہنچے جہاں ماؤنٹ پلیزنٹ

روڈ پر قائداعظم کی مشہور کوٹھی تھی۔ دوران ملاقات قائداعظم سر عبداللہ کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے گفتگو کا رخ مولانا مہر مرحوم کی طرف موڑ دیا۔ مہر صاحب نے حاضری کا مقصد بیان کیا۔ ایسے دل نشین انداز میں اور اتنے مختصر الفاظ میں کہ تقریباً پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد قائداعظم رح نے بلا توقف ہم کو سر اکبر حیدری سے ملنے کی اجازت دے دی۔ گو کہ قائداعظم نے یہ کھل کر کہا نہیں مگر ہم نے محسوس کیا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "اکبر حیدری سے ہم کو کچھ حاصل تو ہوگا نہیں مگر یہ بھی ایک منزل ہے جس سے گزرنا ناگزیر ہے۔ لہٰذا ان سے ملو، ان سے باتیں کرلو وہ خواہ کارآمد ثابت ہوں یا نہ ہوں، آپ اپنا فرض پورا کر دیں ــــــ"

یہ بہت بڑی ڈپلومیٹک کامیابی تھی۔ قائداعظمؒ سے یہ اجازت حاصل کرنا کہ ہم ان کی جماعت کی طرف سے بصورت وفد خود جا کر اکبر حیدری سے ملیں، اور ان سے تعاون کی درخواست کریں۔

سر اکبر حیدری سے ملاقات:

بعد میں اکبر حیدری مرحوم سے ہمارے وفد کی ملاقات اس سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔ وہ بھی اسی ملبار ہل پر حیدرآباد کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ ہم سب دوسرے روز ان کے یہاں حاضر ہوئے۔ وہاں بھی وفد کی طرف سے ترجمان مولانا مہر تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں مولانا نے ان پر واضح کر دیا:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ تہیہ کیا ہوا ہے کہ وہ کسی صورت میں" متحدہ ہندوستان (اکھنڈ بھارت) ۔ بننے نہیں دیں گے۔ وہ اپنے لیے علاحدہ، ریاست بنوائیں گے۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کے اس نصب العین کا سوال ہے، حیدرآباد کی مصلحتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ حیدرآباد کے نظام صاحب چاہیں یا نہ چاہیں، ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کا بٹوارا ضرور کروائیں گے۔ اب پوچھنا صرف یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے مسلمان حیدرآباد کے تحفظ کے لیے بھی کچھ کر سکتے

یا نہیں ؟ یہ فیصلہ حیدرآباد والوں کو کرنا ہے۔ ہم صرف اتمام حجت کے لیے حاضر ہوئے ہیں "

یہ لب لباب تھا مولانا کی ابتدائی تقریر کا۔ اس سے بے انتہا شان استغنا کا اظہار ہو رہا تھا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے سر اکبر حیدری سے کہا کہ "حیدرآباد کے مستقبل کے بارے میں ساری ذمے داری آپ کی ذات پر عاید ہوتی ہے۔ اگر حیدرآباد باقی مسلمان قوم سے علاحدہ رہ کر ایک ایسے علاقے میں جہاں اکثریت ہندؤوں کی ہے محفوظ رہ سکتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ مسلمانوں کی علاحدہ ریاست بن جائے گی، اور باقی ہندوستان ہندو کے رحم وکرم پر رہ جائے گا۔ تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ البتہ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ حیدرآباد کے حق میں یہ اقدام، اقدام خودکشی ثابت ہوگا۔ اور اس کے ذمے دار آپ ہوں گے۔

چلتے چلتے مولانا نے انگریزوں کے بارے میں بھی کہہ دیا: ہماری سوچ اور منصوبہ بندی کا تعلق اس زمانے سے ہے جب انگریز یہاں نہیں ہوگا۔ اور اگر حیدرآباد کے مستقبل کا انحصار تنہا انگریز پر رہے گا تو جب انگریز نہیں ہوگا تو حیدرآباد کا کیا ہوگا۔ آپ کو ان خطوط اور ایسے امکانات پر بھی سوچنا چاہیے "

اکبر حیدری زیادہ تر سنتے رہے۔ کبھی کبھی ایک یا دو لفظ بیچ میں بول بھی دیتے تھے۔ مگر اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا کی باتیں ان پر اثر کرتی جا رہی ہیں۔

آخر میں انھوں نے فرمایا: ہم آپ کے خیالات اعلیٰ حضرت نظام تک پہنچا دیں گے، اور اپنے ذہن میں بھی رکھیں گے۔ آیندہ کے لیے ہم آپ سے سر سکندر حیات خان وزیر اعلیٰ پنجاب کی وساطت سے رابطہ قائم رکھیں گے۔ آپ ان سے ضرور ملتے رہیں "

مالی امداد کے بارے میں مولانا نے ایک لفظ نہیں کہا۔ سر عبداللہ ھارون متعجب تھے کہ مولانا یہ بات کیوں بھول گئے۔ مولانا نے یہ کہہ کر ان کو مطمئن کر دیا کہ

"اگر حیدر آباد والے اصولی باتوں کے قائل ہو گئے تو ہمارے بن کہے ان کی طرف سے مالی امداد شروع ہو جائے گی کیوں کہ یہی ایک چیز ہے جو وہ اس وقت کر سکتے ہیں۔ ہماری ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے"

مقصد میں کامیابی :

چند دن بمبئی میں رہ کر ہم لاہور پہنچے تو سر سکندر حیات خان نے بتایا کہ سر اکبر حیدری وفد کی باتوں سے کافی متاثر ہوئے ہیں، اور انھوں نے ایک لاکھ روپے کا چیک مسلم لیگ فنڈ کے لیے ان کے نام بھیج دیا ہے۔ ہندوؤں کے ڈر سے وہ براہ راست مسلم لیگ کے نام پر روپیہ نہیں بھیج سکتے تھے۔ سر سکندر حیات یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے جو ہندو مسلمانوں اور سکھوں کی مشترکہ پارٹی تھی۔

یہ روپیہ سر عبداللہ ہارون نے نہیں لیا، اور نہ ہی پاکستان تحریک پر صرف کیا۔ غالباً یہ روپیہ مرکزی مسلم لیگ فنڈ میں جمع ہوا۔

سر سکندر مرحوم کے ذریعے کچھ عرصہ کے بعد، یہ بھی معلوم ہوا کہ سر اکبر حیدری نے وائسرائے سے کہا ہے کہ مسلم لیگ تحریک کو معمولی اور وقتی تحریک نہیں سمجھنا چاہیے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی سیاست کا رُخ اس کی طرف ہی مڑ جائے گا۔ مزید یہ کہ فی الوقت حیدر آباد کے مسلمانوں کو ہر چند روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر ان کا طبعی میلان مسلم لیگ کی طرف ہی ہے۔

اِس ابتدائی دَور کے حالات کی رو سے سر اکبر کا اتنا کہہ دینا بھی بڑی بات تھی۔ اور یہ مولانا کی ڈپلومیسی کا نتیجہ تھا۔

(۲۹ رمئی ۱۹۷۲ء)

باب نہم :

مولانا مہر کی رفاقت میں ایک سفر

۳۲ سالہ تعلقات :

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی معیت میں، میں نہ صرف ہندوستان میں گھوما پھرا بلکہ ایک مرتبہ تقریباً سارے مڈل ایسٹ کا بھی دورہ کیا۔ میں اپنے کو ان کا رفیق یا ہم پلہ نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے سامنے میری حیثیت ہمیشہ ایک طالب علم کی رہی۔ ہر وقت یہ خواہش رہی کہ ان سے کچھ سیکھ لوں، کچھ حاصل کر لوں۔ کئی علوم میں وہ بحر بیکراں تھے۔ میری کیا مجال کہ میرے دل میں کبھی ان کی ہمسری کا خیال تک آتا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب ہم سفر میں ہوتے تھے تو باوجود اس کے کہ ہم اکثر آپس میں مذاق بھی کرتے رہتے تھے۔ میں ان کی خدمت اسی طرح کرتا تھا جس طرح ان کا ملازم ننکو ان کی خدمت ان کے گھر پر کرتا تھا۔ طالب علم جب تک اپنے خلوص اور اپنی خدمت گذاری سے اپنے استاد کے دل میں جگہ نہ پیدا کر لے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ پورے ۳۲ سال میں اپنی طرف سے اس اصول پر کاربند رہا۔

لیاقت نہرو معاہدہ اور اخبارات :

ہوائی جہاز میں میرا پہلا سفر مولانا مرحوم کی معیت میں ہوا۔ میں ہوائی جہاز سے بہت ڈرتا تھا، اور اب بھی ڈرتا ہوں۔ فی الحقیقت مولانا نے خود بھی اس سے پہلے کبھی ہوائی جہاز سے سفر نہیں کیا تھا۔ ۵۰-۱۹۴۹ میں لیاقت، نہرو پیکٹ کے تتمہ کے طور پر پاکستان اور ہندوستان کے ایڈیٹروں کے مابین رابطہ پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے ایڈیٹروں کی ایک مشترکہ کمیٹی بھی بنی تھی جس کا مجھے چیئرمین بنایا گیا۔ ہوائی جہاز سے ہمارے سفر کا پس منظر یہ تھا۔ اس زمانے میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں ملکوں کے مابین اخبارات کے تبادلے میں حکومتوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی

ہندوستان اور پاکستان کی مرکزی حکومتوں نے تو اس معاہدے کے مطابق اخبارات کے تبادلے پر سے پابندیاں اٹھادی تھیں۔

ہندوستانی اخبارات پر پابندی :

مگر مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت یہ بات نہیں مان رہی تھی۔ معاہدہ کیے ہوئے دو تین مہینے گزر چکے تھے۔ مگر مشرقی پاکستان کی حکومت اس کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کلکتہ کے اخبارات کے اپنے یہاں آنے پر سے پابندی ہٹا دے۔ ہندوستان کے اخبارات نے اس بات پر سخت اعتراض کیا تھا۔ اور انھوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ "اگر پاکستان والے اس معمولی سی بات کے بارے میں اپنے معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتے تو وہ نہرو لیاقت پیکٹ پر کس طرح ثابت قدم رہ سکیں گے۔ لہٰذا ہندوستان کو نہرو لیاقت پیکٹ ابھی سے توڑ دینا چاہیے"۔ ان کی فوجیں پاکستان کی سرحد پر پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں، اور اس وجہ سے ہندؤوں کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف پاکستان کے حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس وقت جنگ نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ قائد ملت مرحوم کو بذات خود دہلی تشریف لے جا کر پنڈت نہرو سے وہ معاہدہ کرنا پڑا تھا جو "لیاقت نہرو پیکٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔

ایڈیٹروں کا اجلاس ڈھاکا :

خواجہ شہاب الدین صاحب نے جو اس وقت وزیر اطلاعات تھے، ہماری مشترکہ کمیٹی کا اجلاس ڈھاکا میں بلانے کا فیصلہ کیا تاکہ پیدا شدہ بحران کو سلجھانے کی کوشش کی جائے ــــ میں نے اس بنا پر ڈھاکا جانے سے معذوری کا اظہار کیا کہ ریل کا سفر ڈھاکا تک تکلیف دہ ہوگا، اور ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی میں اسی اصول پر عمل کرتا رہا تھا۔

ایک مرتبہ دہلی جانا ہوا تھا تو میں بذریعہ ریل گیا تھا اور سرحدیں جو اس زمانے میں "سِیل" تھیں خاص میرے جانے کے لیے کھول دی گئی تھیں۔ تو ایسے حالات میں میرے ڈھاکا جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب کی نفسیات :

خواجہ صاحب نے ابتدا میں تو میرے جانے یا نہ جانے کی چنداں پروا نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ میرے بغیر بھی ان کا کام نکل جائے گا اور وہ صورت ان کے لیے بہتر رہے گی کیوں کہ مجھے جو پبلسٹی، اس کام کے سلسلے میں، دونوں ملکوں میں مل رہی تھی وہ اس کو اپنے سیاسی مستقبل کے لیے فال نیک نہیں سمجھتے تھے۔ نیتوں کا جاننے والا تو اللہ تعالیٰ ہے مگر بعض لوگ کہتے تھے کہ خواجہ صاحب ایک دور بین سیاست داں ہیں، اور ان کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو چکا ہے کہ اخباری دنیا میں کہیں میری اہمیت اِس قدر نہ بڑھ جائے کہ مستقبل میں وزارت اطلاعات کے لیے میں ان کا حریف بن جاؤں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کا یہ اندازہ صحیح تھا یا غلط۔ ظاہری طور پر تو خواجہ صاحب مجھ پر بڑے مہربان نظر آتے تھے۔

مشکلات :

بہر نوع، بد قسمتی سے ڈھاکا پہنچنے کے بعد خواجہ صاحب کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایڈیٹروں نے کلکتہ میں جمع ہو کر آخری طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ڈھاکہ کی میٹنگ کا اس بنا پر بائیکاٹ کریں گے کہ پاکستان نے ہندوستان کے اخبارات پر سے مکمل طور پر پابندی نہیں ہٹائی ہے، اور اس طرح سے اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ ایڈیٹروں نے اشارتاً یہ دھمکی بھی دی تھی کہ جو ملک (یعنی پاکستان) اخبارات کے بارے میں ایک معمولی معاہدے کی پابندی نہیں کر سکتا۔ وہ بین المملکتی لیاقت نہرو پیکٹ پر کس طرح ثابت قدم رہ سکے گا؟ — لہٰذا پیکٹ کو رد کرانے اور پاکستان پر فوج کشی کے لیے ہندوستان کے اخبارات کو فوراً ایجیٹیشن شروع کر دینا چاہیے!

خواجہ صاحب نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ ڈھاکا میں جمع شدہ کمیٹی کے پاکستانی ممبروں میں سے کچھ لوگوں کو کلکتہ بھیج کر ہندوستانی ایڈیٹروں کو ڈھاکا آنے کے لیے آمادہ کریں۔ مگر جب ان کی وہ کوشش بھی ناکامیاب ثابت ہوئی تو ان کو میری

عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ انھوں نے کراچی میں موجود مرکزی حکومت کے اراکین کے ذریعے مجھے کہلوایا کہ مَیں فوراً ڈھاکا پہنچ جاؤں کیوں کہ عام اصطلاح کے مطابق "ملک کا نقصان ہو رہا ہے"۔ میں نے کہا کہ اب ریل سے ڈھاکا پہنچنے کے لیے وقت نہیں رہا۔ اور ہوائی جہاز سے سفر کرنے کے لیے مَیں تیار نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے یہ عذر بھی پیش کیا کہ اب وہاں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو چکی ہے جس سے میں نمٹ نہیں سکتا۔

مولانا مہر کی رفاقت :

میری ضد سے عاجز آ کر اوپر والوں نے مولانا مہر کو کراچی بلایا۔ اور ان کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈلوایا کہ میں ضرور ڈھاکا جاؤں اور ہوائی جہاز سے جاؤں۔ میں نے عاجز آ کر یہ شرط ڈال دی کہ ہوائی جہاز میں مولانا بھی میرے ساتھ چلیں، اور پہلے کلکتہ پہنچ کر ہندوستان کے ایڈیٹروں سے باتیں کر کے ان کے بائیکاٹ کو ختم کروائیں۔ مولانا مجبوراً دونوں باتوں پر رضامند ہو گئے۔ مجھے بہت کچھ برا بھلا کہا، مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ "کہ اگر ملک کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر مرنے کا مسئلہ درپیش ہے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور مریں کیوں کہ اس ملک کو بنانے میں مجھ سے بدرجہا زیادہ آپ کا ہاتھ رہا ہے۔ آپ زمین پر بیٹھے اطمینان سے کتابیں پڑھتے اور لکھتے رہیں، اور میں ہوائی جہاز میں لدا ہوا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہوں۔ یہ مجھ سے قطعاً نہیں ہو گا"۔

مولانا مجبور ہو گئے۔ البتہ اپنی ناراضگی کا اظہار کافی تلخ الفاظ میں فرمایا۔ مثلاً "تم اپنی حماقت سے پہلے خود جا کر ٹھگوں کے جال میں پھنستے ہو، اور بعد میں دوسروں کو پھنسوا کر پریشان کرواتے ہو۔ اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن"۔ مولانا کے منہ سے اگر کبھی سخت الفاظ نکلتے تھے تو بھی گویا پھول جھڑتے تھے۔ مجھ پر ان کا خاص کرم رہتا تھا۔ ان کی گفتگو مجھ سے ہمیشہ بے تکلفانہ ہوتی تھی۔ بہت کچھ کہہ جاتے تھے، اور ساتھ ساتھ خود بھی ہنستے رہتے، اور میں بھی ہنستا رہتا تھا۔ میں کیا چیز تھا۔؟ اس

زما۔نے ہیں تو لوگ۔ دوران گفتگو حکومت پر بھی کھُل کر اور بلا خوف نکتہ چینی کرسکتے تھے۔ جمہوریت، کا گلا ابھی نہیں گھونٹا گیا تھا، نہ مارشل لا تھا۔ نہ ایوب خان کی حکومت کی طرح مرکز نے ڈھائی کروڑ روپیہ کی فارن کرنسی خرچ کر کے جاسوسی کے برقی آلے ELECTRONIC DEVICES منگوائے تھے جن کے ذریعے اگر گھر بیٹھے شوہر اور بیوی آپس میں باتیں کریں تو وہ بھی حکومت کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ یہ سب بعد کی برکتیں تھیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ آزادی حاصل ہو چکی تھی۔ مگر یار لوگوں نے ابھی اپنوں سے اس کی قیمت وصول کرنے کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ قائد ملت کا دَور تھا۔ "ہر چہ در دل آرد بگوید" کی آزادی ہنوز کاملاً سلب نہیں ہوئی تھی۔ یہ "ہر کہ دست از جان بشوید" کی شرط بعد میں لگی۔ بالفاظ دیگر برق آمریت ابھی پورے زور سے خرمن جمہوریت پر نہیں گری تھی۔

ایک دلچسپ سفر:

قصہ مختصر۔ ایک گھنٹے کے اندر سرکار والا تبار کی طرف سے ہم دونوں کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ موصول ہو گئے — کراچی سے کلکتہ — کلکتہ سے ڈھاکا — درجہ اول — جہاز پان امریکن — روانگی اسی شام — عذر معذور ناقابل سماعت!

ٹکٹ آ گئے تو مولانا ان کو ہاتھ میں لے کر ان کی طرف گھورنے لگے۔

موقع پا کر میں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

میں نے کہا: "قبلہ! اب کیا دیکھتے ہیں آپ! یہ موت کے پروانے ہیں جو آپ کے اور میرے حق میں جاری ہو چکے ہیں۔ اب چلیے اور موت کا مزہ چکھیے! اگر جہاز راستے میں گر گیا اور ہم مر گئے تو وزارت، اطلاعات ونشریات دل ہی دل میں کہے گی کہ چلو اچھا ہوا، کم از کم دو اہل قلم جو ہماری گھاتوں کو سمجھ سکتے تھے ختم ہو گئے۔ اور اگر ہم خیریت سے منزل مقصود تک پہنچ گئے اور وہاں کامیابی حاصل کر لی تو وزیر اطلاعات کی طرف سے وزیر اعظم کے یہاں محض رپورٹ جائے گی کہ

یہ معرکہ عظیم محض "فدوی" یعنی آپ کے اس عاجز بندہ نے تنہا اپنی ناچیز کوششوں، آپ کی پُر اثر دعاؤں کی برکت اور ایک خاص حکمت عملی سے سر کر لیا۔ مولوی مہر کو تو ہندوستان کا کوئی اخبار نویس جانتا ہی نہیں تھا۔ رہا راشدی تو وہ اندر ہی اندر سے شرارتیں کر رہا تھا۔"

مولانا غور سے میری تقریر سن رہے تھے۔ میں نے مزید عرض کیا :

"مولانا مجھے تو ان لوگوں کا تجربہ ہو چکا تھا اور میں ان کے نرغے سے نکل چکا تھا۔ مگر انھوں نے آپ کو بیچ میں لا کر مجھے دوبارہ پھانس لیا ہے۔"

مولانا نے فرمایا : اگر ہم اس سفر کے دوران کسی حادثے کا شکار ہو گئے تو ہمارے بچوں کا کیا ہو گا؟

میں نے کہا : " وہی ہو گا جو ان لوگوں کے بچوں کا ہوا ہے جنھوں نے لاکھوں کی تعداد میں پاکستان کی خاطر اپنی جانیں قربان کر ڈالی ہیں۔"

مولانا :۔ "ظالم ! تمہارے پاس تو زمین ہے۔ میری تو ساری جائیداد ـــ زمین آبائی مکان وغیرہ صوبہ پنجاب کی تقسیم کی وجہ سے سرحد کے دوسری طرف رہ گئی ہے۔ میرے بچے کہاں سے کھائیں گے۔ ؟"

میں نے تسلی دی "اللہ مالک ہے۔ اب صبر اور شکر کے ساتھ اپنے کیے کی سزا بھگت لو۔

غرض اس نوک جھونک کے بعد ہم ایر پورٹ پہنچ کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ اس زمانے میں بوئنگ نہیں تھے۔ کانسٹیلیشن ٹائپ کے جہاز چلتے تھے۔ مولانا نے جہاز پر قدم رکھتے ہی زور زور سے قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ مجھ سے کہا کہ تم بھی "یا حفیظ" پڑھتے رہو۔ یہ کانسٹیلیشن جہاز بڑی بلندی پر پرواز نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا کبھی "ایر پاکٹس" میں پھنس کر نیچے گرتا تھا، کبھی اوپر چلا جاتا تھا۔ ہچکولے اس قدر شدید کہ سر چکراتا رہتا تھا۔ جب کبھی زبردست جھٹکا آتا تھا تو میں مولانا کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا، اور آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ آنکھیں تو مولانا کی بھی بند رہتی تھی۔ مگر جس

تناسب سے جھٹکے آتے تھے اسی تناسب سے مولانا کی قرآن خوانی کی رفتار تیز ہو جاتی تھی۔ یہ پانچ چھ گھنٹے بڑی ذہنی اذیت کی کیفیت میں گزرے۔ چہرے پر سے سارا وقت پسینہ پونچھا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کا مسئلہ تو پیدا ہی نہیں ہوا۔ خدا خدا کر کے ڈم ڈم ایر پورٹ آیا، اور ہم نیم مردہ حالت میں جہاز پر سے اتر گئے۔ مجھ میں پیدل چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ خوش قسمتی سے کچھ سندھی شرنارتھی جو ایر پورٹ کی انتظامیہ سے وابستہ تھے۔ یہ خبر سُن کر سندھ کا ایک پیر آرہا ہے، ایک بڑی آرام کرسی لے کر سیڑھی کے قریب جمع ہو گئے تھے، کرسی کو پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر انھوں نے کرسی اپنے کاندھوں پر اٹھالی۔ اور مجھے جلوس کی صورت میں ایر پورٹ سے نکال کر موٹر اسٹینڈ تک لے آئے۔ مولانا جلوس کے ساتھ پیدل چلتے رہے، اور دل ہی دل میں شاید مجھے کوستے رہے۔ موٹر میں بیٹھے تو کبیدہ خاطر نظر آئے۔ میں نے کہا "کیا مولانا ابھی تک تکان کا اثر رفع نہیں ہوا؟ فرمایا تکان وکان کچھ نہیں تمھاری بدتمیزی کا مسئلہ ہے خود تو پھولوں سے سجی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اور میں سامان "کلیئر" کرانے کے لیے پریشان رہا۔"

میں نے کہا: "پریشانی کا گلہ بے وجہ ہے کیوں کہ ہم موٹر تک پہنچے اس سے پہلے ہی ہمارا سامان کلیر ہو کر موٹر میں لد چکا تھا۔"

مولانا: "مجھے کیا معلوم کہ یہاں بھی تمھارے سندھی موجود ہوں گے۔ جو سب کچھ انتظام خود کرلیں گے۔ میں تو اس اثنا میں پریشان رہا۔"

میں نے کہا "میرے گناہ آپ کے گناہوں سے کم تھے۔ لہٰذا مجھے کم پریشانی ہوئی۔" یہ اشارہ ماضی کی ہماری قومی خدمات کی طرف تھا۔

بہر حال ہم نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ باقی سفر اور واپسی کا انتظام ریل سے ہوگا۔ ہوائی جہاز پر سواری کی حماقت دہرائی نہیں جائے گی۔

تاریخ ساز ایڈیٹر:

دوسرے روز ہندوستان کے ایڈیٹروں سے "انند بازار پتریکا" کے دفتر میں ہماری

گفتگو ہوئی۔ امرتا بازار پتریکا، انندا بازار پتریکا، موڈرن ریویو، اسٹیٹسمین، ہندوستان ٹائمز، نیشنل کال، پائنیر۔ ٹریبون، ٹائمز آف انڈیا، بمبئی کرانیکل۔ ہندو مدراس۔ غرض جتنے بڑے بڑے ہندوستان کے اخبار تھے ان کے ایڈیٹر وہاں جمع تھے۔ یہ ایڈیٹر وہ لوگ تھے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ بنائی تھی۔ یہ آج سے بائیس سال پہلے کا قصہ ہے۔ اس وقت تک وہ سب صحافی زندہ وسلامت تھے جن کے نام ہندوستان کی صحافت اور سیاست کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ اور درخشندہ رہیں گے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی صحافت کا پیشہ اس لیے اختیار نہیں کیا تھا کہ اس کے ذریعے مال و دولت جمع کرے۔

کلکتہ میں کامیابی :

ان میں سے بہت سارے لوگ مولا مہر کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مولانا اور میں میٹنگ میں پہنچے تو مولانا کو دیکھ کر وہ کسی قدر مرعوب ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا کے لیے ان سب کو بے انتہا احترام تھا۔ وہ ان کو مولانا آزاد کا ہم پلہ صحافی اور عالم سمجھتے تھے۔ ٹریبون کے ایڈیٹر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

"ہمارے پنجاب نے دو مسلمان INTELLECTUAL پیدا کیے ہیں۔
ایک سر فضل حسین مرحوم اور دوسرے یہ مولانا مہر"

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ مولانا سے غیر رسمی باتیں کرتے رہے، مولانا ان سب پر چھائے رہے۔

اصل مقصد کی باتیں شروع ہوئیں تو امرتا بازار پتریکا کے ایڈیٹر تشر کانتی گھوش نے سب کی طرف سے صورتِ حال پیش کی، اور ہندوستان کے ایڈیٹروں کا مجموعی موقف نیشنل کال دہلی کے ایڈیٹر نے بیان کیا۔ میں صدارت کر رہا تھا۔ میں نے مولانا سے درخواست کی کہ ہماری پوزیشن وہ واضح کریں۔

مولانا نے ہماری پوزیشن کچھ اس طرح سے ان کے سامنے بیان کی کہ انھوں نے کہہ دیا کہ :

"اگر آپ کا خیال ہے کہ ہمارے ڈھاکا چلنے سے معاملہ سلجھ جائے گا تو ہم آپ کے ساتھ اور آپ کی ضمانت پر، وہاں چلنے کے لیے تیار ہیں۔"

طے یہ ہوا کہ ہندوستان کے ایڈیٹروں کو تو ایک خاص طیارہ اسی شام ڈھاکا پہنچا دے گا۔ باقی ہیں اور مولانا، بذریعہ ریل کلکتہ سے گوالندو جائیں گے، اور وہاں سے پانی کے جہاز میں بیٹھ کر نارائن گنج اتر جائیں گے۔ نارائن گنج سے ڈھاکا تک کا سفر موٹر میں ہوگا۔ ہم نے اسی پروگرام پر عمل کیا۔ اور دوسری شام ڈھاکا پہنچ گئے۔

صوبائی وزرا کی بے بسی کا عالم:

وہاں کا معاملہ تو کافی کشمکش کے بعد بالآخر طے ہوگیا۔ مگر ڈھاکا میں جو کچھ ہم نے دیکھا وہ مستقبل کے نقطۂ نظر سے کافی مایوس کن تھا۔ مرکزی حکومت نے مغربی پاکستان کے چند افسروں کو سیکریٹری بنا کر وہاں بھیج دیا تھا۔ یہ لوگ تنہا اپنی ذات گرامی کو مملکت پاکستان کا والی وارث سمجھتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے صوبائی وزیروں کی وہ کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کو جو کچھ جی میں آتا تھا وہ براہ راست مرکز سے منظوری حاصل کر کے خود کر گزرتے تھے۔ صوبائی وزیروں کو خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ ڈھاکا کلب میں وزیروں سے ہماری ملاقاتیں ہوتی تھیں تو وہ سب اپنی بے بسی کا رونا روتے رہتے تھے۔ ایک ہندوستانی ایڈیٹر نے صوبائی وزیر اطلاعات سے پوچھا کہ "آپ اخبارات کے تبادلے کے متعلق کیے ہوئے معاہدے پر کیوں نہیں عمل کرتے؟" تو وزیر نے کھل کر کہہ دیا کہ "ہم کو خبر تک نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم پر تو مغربی پاکستان سے آئے ہوئے چیف سیکریٹری کا راج ہے۔ ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہم مجبور ہیں۔"

مولانا مہر یہ سب کچھ سنتے تھے مگر بولتے کچھ نہیں تھے۔ ایک روز میں نے بہت اصرار کیا تو صرف اتنا کہا:

"کراں (ایک سخت لفظ استعمال کیا) .... اور کوتاہ اندیشوں نے بیڑا غرق کر دیا۔"

واپسی کا سفر:

واپسی کا سفر بذریعہ ریل ہوا۔ گوالندو سے لاہور تک البتہ نارائن گنج سے گوالندو

تک پہلے کی طرح اب بھی پانی کے جہاز سے سفر کرنا پڑا۔ جس وقت ہم جہاز سے اتر کر ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے تو زور کی بارش پڑ رہی تھی۔ سامان اٹھانے کے لیے کوئی مزدور نہیں تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے بکس اور بستر اٹھائے اور بھیگتے، پھسلتے، گرتے، پڑتے، کسی طرح پلیٹ فارم تک پہنچ گئے۔ مولانا کو کافی تکلیف پہنچی۔ میں شرمندہ تھا کہ میرے ساتھ دوستی کی وجہ سے ان کو یہ زحمت اٹھانا پڑی۔

مولانا بالطبع غیر معمولی طور پر صفائی پسند اور نازک مزاج تھے۔ ریل کا سفر ہوتا تھا تو وہ راستے کی مٹی اور گرد و غبار سے بہت گھبراتے تھے۔ وہ قطعاً یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ڈبے میں فرش پر یا نشستوں پر مٹی کی تہ جمی رہے۔ چنانچہ میرا دستور یہ تھا کہ جب مولانا کے ہم رکاب کہیں ریل سے سفر کرنے کا پروگرام بنتا تھا تو میں ایک جھاڑو اور کپڑے کا جھاڑن ساتھ رکھ لیتا تھا جیسے ہی دوران سفر مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں، یہ شکایت کی کہ:

"راشدی، بہت تکلیف ہو رہی ہے"

تو میں نے فوراً جھاڑو اور جھاڑن پھرا کر ڈبہ صاف کر دیا۔ جب تک مجھے مولانا سے ہم سفری کی سعادت حاصل ہوتی رہی مجھے یہ سعادت بھی ملیسر رہی۔

(۵ جون ۱۹۷۲ء)

ضمیمہ : ۱

پاکستان اسکیم

اس کتاب کے باب سوم سے لے کر باب ہفتم تک مسلم لیگ کی خارجہ کمیٹی کے تحت حاجی سَر عبداللہ ہارون کی سربراہی میں قائم ہونے والی سب کمیٹی اور برصغیر کے فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے کے بارے میں اس کی تجویز کا ذکر آیا ہے، جسے پیر علی محمد راشدی مرحوم نے "پاکستان اسکیم" کا نام دیا ہے۔ اس کے بارے میں مرحوم کا خیال ہے کہ مسلم لیگ کی جانب سے اسے نظرانداز کر دیے جانے کی وجہ سے بعض پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور مسلم لیگ کے مطالبہ تقسیم کو مان لیے جانے کے باوجود وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے، جو مقصود تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ہند کے فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے کے بارے میں جو تجاویز بھی پیش کی جاتی رہی تھیں، ان کے بانیوں، ان کے معتقدوں اور ان کی جماعتوں کو اصرار رہا ہے کہ انھی کی تجاویز سب سے بہتر اور مسئلے کا وہی صحیح حل تھیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان حضرات کے اخلاص کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لیکن ابھی تک تمام تجاویز کو ان کی کلی تفاصیل و تشریحات کو مرتب کر کے شائع بھی نہیں کیا جا سکا۔ ان کے تقابلی اور تجزیاتی مطالعے کا عمل کیوں کر انجام دیا جا سکتا ہے۔ منصفانہ تحقیقی رائے کا قیام تو اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے تقابلی مطالعے، تجزیاتی عمل اور تحقیق کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، بعض حضرات کو خطرہ ہے کہ اس طرح کے مطالعہ و تحقیق کے بعد کہیں کوئی تجویز قرارداد لاہور (۱۹۴۰ء) سے اصح اور برطانوی ہند کے فرقہ وارانہ مسئلے کا زیادہ بہتر حل ثابت نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ پاکستان کی فکری اور سیاسی تاریخ کا ایک بہت بڑا حادثہ ہوگا۔ لیکن اس قسم کے خطرات مطالعہ و تحقیق کی راہ میں ہمیشہ کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

بہرحال پیر علی محمد راشدی مرحوم کے خیالات کو سمجھنے کے لیے پاکستان اسکیم کا مطالعہ ضروری ہے۔

یہ اسکیم امجد سلیم علوی ابن مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی عنایت سے پہلی بار شائع کی جا رہی ہے۔ اس کے ترجمے کے لیے جناب حسین حسنی کا شکریہ واجب ہے۔

(ابوسلمان شاہجہان پوری)

نیپیر روڈ۔ کراچی
۲۳ر دسمبر ۱۹۴۰ء

بخدمت صدر آل انڈیا مسلم لیگ

جناب عالی!

مجھے یہ بیان کرنے کا اعزاز حاصل ہے کہ

(۱) اس سال کی فروری میں خارجہ کمیٹی نے ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے لیے مختلف اسکیموں کے مرتبین کو مذکورہ کمیٹی کے تحت آپس میں مل بیٹھنے، صلاح و مشورہ اور تمام اسکیموں کا جائزہ لے کر ایک جامع اسکیم مرتب کرنے کے لیے دعوت نامے ارسال کیے تھے۔ ہر مرتب نے دعوت نامے کو فوراً منظور کر لیا، اور وہ سب ایک کمیٹی کی صورت میں پہلے فروری (۱۹۴۰ء) میں بمقام دہلی اور اس کے بعد گزشتہ نومبر (۱۹۴۰ء) میں جمع ہوئے۔ پہلے دور میں اعداد و شمار پر کام ہوا، اور دوسرے دور میں بنیادی اصول مرتب کیے گئے۔ اگلے صفحات میں اس کمیٹی نے جو چھان بین کی اور ان اسکیموں کے مرتبین نے جو معلومات حاصل کیں ان کے نتائج دیے جا رہے ہیں۔

(۲) مندرجہ ذیل اشخاص نے کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لیا اور اپنی رائے کا اظہار کیا:

(۱) حاجی سر عبداللہ ہارون۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ (مرکزی)
(۲) مولانا غلام رسول مہر۔ ایڈیٹر انقلاب۔ لاہور
(۳) نواب سر شاہ نواز خان۔ ممدوٹ۔
(۴) مسٹر رضوان اللہ۔ ایم۔ ایل۔ اے۔
(۵) ڈاکٹر افضال حسین قادری۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔
(۶) ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
(۷) چودھری اختر حسین۔ ایم۔ ایل۔ سی۔
(۸) مسٹر اے پنجابی اور
(۹) سید علی محمد اے ایچ راشدی۔ سیکرٹری۔

(۳) اس اسکیم کی حمایت میں جو دلائل دیے گئے ہیں انھیں ان صفحات میں نہیں چھیڑا

گیا ہے۔ یہ کام مولانا غلام رسول مہر اور مسٹر راشدی کے ذمے لگایا گیا ہے کہ وہ اس اسکیم کے بارے میں عام پبلک کے لیے ایک کتابچہ مرتب کریں۔ اس رپورٹ میں اس اسکیم کے بارے میں حسب ضرورت مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اگر آل انڈیا مسلم لیگ ان نتائج اور دلائل کو منظور کرتی ہے تو انھیں شائع کیا جا سکتا ہے۔

(۴) کمیٹی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور کے آخری اجلاس (مارچ ۱۹۴۰ء) کی قرارداد کو اپنی بنیاد بنایا ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ قرارداد اس خاکے کی روشنی میں مرتب کی ہے، جو میں نے آخر فروری میں آپ کو ایک یادداشت کی صورت میں پیش کیا تھا۔ یہ قرارداد اُس اجلاس میں سامنے آئی جو برطانوی ہند کے لیے ایک بنیادی دستوری خاکہ مرتب کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ کمیٹی کے سامنے یہی کام نہیں تھا کہ وہ کچھ اصول مرتب کر دے تاکہ اس قرارداد پر عمل درآمد ہو سکے بلکہ یہ کام بھی تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ یہ لیگی اسکیم برطانوی ہند کے باہر کے تمام مسلمانوں کے مستقبل کا کس طرح احاطہ کرتی ہے اور کمیٹی نے یہ بھی محسوس کیا کہ کوئی دستوری خاکہ ۹ کروڑ مسلمانان ہند کے لیے مکمل نہ ہوگا جب تک کہ ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں کو اس کے دائرہ کار میں نہ لایا جائے۔

یہ مجوزہ اسکیم جو ذیل میں دی جا رہی ہے اس اسکیم کے مقابلے میں مکمل ہے جو اُس قرارداد (مارچ ۱۹۴۰ء) میں سامنے آئی۔ کمیٹی کو امید ہے کہ یہ بات بھی ذہن میں رہے گی کہ یہ تمام تجاویز قرارداد لاہور کے دائرۂ کار کے اندر ہیں۔ اور اُسے ایک زیادہ واضح شکل میں پیش کرنے کے لیے ہیں۔

(۵) قرارداد لاہور میں تین اصول بیان کیے گئے ہیں:

(الف) برطانوی ہند کو یہ طے کرنا ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے یعنی ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے، ضرورت کے مطابق اس طرح ترتیب دیے جائیں کہ وہ آزاد ریاستیں بن جائیں اور وہ اقتدار اعلیٰ کی بھی حامل ہوں۔

(ب) اور یہ دونوں علاقائی ریاستیں ضرورت کے مطابق دفاع، خارجہ تعلقات، مواصلات، محصولات اور اسی طرح کے دوسرے معاملات میں قطعی طور پر اقتدار اعلیٰ کی حامل ہوں۔

(ج) دستور میں اقلیتوں کے لیے خاصا موثر اور واضح تحفظ فراہم کیا جائے۔

(۶) کمیٹی نے ہندوستان میں تقسیم آبادی کا بھی بہت غور کے ساتھ جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اس حقیقت کے باوجود مسلمان بے ترتیب طریقہ سے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، تاہم بعض علاقے ایسے ہیں جہاں آسانی کے ساتھ مسلم ریاستیں تشکیل دی جا سکتی ہیں۔ کیوں کہ وہاں مسلمان آبادی اکثریت میں ہے۔ کمیٹی نے ایسے علاقوں کا تعین کرنے کے بعد سفارش کی کہ ایک مسلم ریاست شمال مغرب میں اور دوسری شمال مشرق میں بنائی جا سکتی ہے۔ یہ بتانا مناسب ہوگا کہ اس انتظام کے تحت مسلمانوں کا جو تناسب محفوظ کیا جا سکتا ہے وہ شمال مغرب میں تقریباً ۶۲ فی صد اور شمال مشرق میں ۵۴ فی صد ہوگا۔

(۷) مجھے بیان کرنے دیجیے کہ کمیٹی نے شمال مغرب کی مسلم ریاست کے لیے مندرجہ ذیل رائے پیش کی ہے:-

شمال مغربی ریاست:

ان رہنما اصولوں کے مطابق ایک ریاست وجود میں لائی جائے جس میں وہ تمام علاقے جو ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ اس افسوس ناک حقیقت کے باوجود کہ ان میں مسلمان آبادی مساویانہ انداز میں واقع نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے درمیان آگئی ہے۔ وہ وفاق کے سوا کسی اور طرح شامل نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ موجودہ صوبہ سندھ، برطانوی بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب کو آپس میں شامل کر کے ایک وفاقی مقتدر ریاست تشکیل دے دی جائے، جس میں صوبہ دہلی کو پنجاب کے ساتھ شامل رکھا جائے۔ اس کو نسلی اور تہذیبی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ اس کی ایک طویل تاریخ بھی وابستہ ہے۔ اس نظریے کے تحت یہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ پنجاب کی مشرقی سرحد کو اس حد تک بڑھا دیا جائے کہ اس میں یو پی میں مسلمانوں کے بڑے بڑے مراکز مثلاً علی گڑھ بھی اس بڑی مسلم ریاست کا جزو بن جائیں۔ مگر یو پی کی اس پٹی کو شامل کرنے کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے ابھی اس کے اعداد

مرتب نہیں کیے گئے ہیں۔ اس بارے میں ایک نوٹ بنا کر بعد میں بھیجا جائے گا۔
اعداد اس طرح مرتب کیے جائیں گے "

شمالی مسلم خطہ

مردم شماری (۱۹۲۱ء)

صوبہ	کل آبادی	مسلم آبادی
پنجاب :	۲،۳۵،۸۰،۸۸۲	۱،۲۳،۳۲،۴۶۰
سندھ :	۳۸،۸۷،۰۷۰	۲۸،۳۰،۸۰۰
صوبہ سرحد (آباد) :	۲۴،۲۵،۰۷۶	۲۲،۲۷،۳۰۳
صوبہ سرحد (قبائلی برطانوی انتظام کے تحت) :	۱۳،۶۷،۳۳۱	۱۳،۱۷،۲۳۱
برطانوی بلوچستان :	۴،۶۳،۵۰۸	۴،۰۵،۳۰۹
صوبہ دہلی :	۶،۳۶،۲۴۶	۲،۰۶،۹۶۰
کل میزان	۳،۲۳،۶۰،۰۱۳	۲،۰۳،۲۰،۰۶۳

وضاحت :

یہ اعداد برطانوی علاقے بشمول دہلی میں مسلم آبادی کی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں۔
اس علاقے میں مسلم آبادی کا تناسب ۶۲٫۷۵ فیصد آتا ہے۔

(۸) شمال مشرقی ریاست کے بارے میں کمیٹی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں موجودہ صوبہ آسام اور بنگال (اضلاع مدناپور اور بانکوڑا علاحدہ کر کے) اور بہار کا ضلع پورنیہ جس کی نسلی اور تہذیبی آبادی بنگال ہی کی طرح ہے، شامل ہونا چاہیے۔
اس علاقے کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں :

کل آبادی : ۵،۷۰،۱۱،۹۴۶

مسلمان : ۳،۰۸،۷۶،۴۲۱ تناسب ۵۴ فیصد

غیر مسلم : ۲،۶۱،۳۴،۵۲۵ " ۴۶ "

غیر مسلم آبادی میں تقریباً ۸۵،۰۰،۰۰۰ یعنی ۳۲ فی صد ذیلی فرقہ (ہریجن) ہیں اور ۱۵،۰۰،۰۰۰ یا ۶ فیصد قبائل اور تقریباً ۴ لاکھ عیسائی آبادی شامل ہے۔

(۹) اگرچہ قرارداد لاہور ابتدائی تجویز کے مطابق صرف برطانوی ہند کے مسلمانوں پر اثرانداز ہوتی تھی پھر بھی اس کمیٹی نے اپنا فرض منصبی سمجھا کہ اپنے مفاد اور تمام مسلمانوں کے مفاد میں یہ مناسب ہوگا کہ مسلم اثرات کو برطانوی ہند کے علاوہ جہاں کہیں بھی ضروری ہو دوامی طور پر محفوظ بنادے لہٰذا اس مقصد کے تحت تمام وہ چھوٹی بڑی ریاستیں جہاں کے حکمراں مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی دستوری اصلاحات میں انھیں بھی آزاد مسلم ریاستیں سمجھا جانا چاہیے۔ یہ ہمارا ایک بنیادی مطالبہ ہونا چاہیے۔ ان مسلم ریاستوں میں حیدرآباد کی ریاست اپنی وسعت کے لحاظ سے کسی فرمان یا حکومت برطانیہ کی مرضی سے دوسری دیسی ریاستوں کی طرح خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، وجود میں نہیں آئی ہے۔ یہ اپنے حق وراثت اور تاریخ کی بنا پر ایک آزاد ریاست ہے جس کے ساتھ برطانوی حکومت نے آپس کے مفاد کی خاطر ایک دوستانہ معاہدہ کیا تھا۔ حقیقتاً یہ درست ہے کہ مختلف معاہدات، انعامات اور جاگیروں کے تحت حکومت برطانیہ کو نظام کی بعض فوجی ذمہ داریوں کی ادائگی کے لیے اس میں اقتدار حاصل تھا۔ بہرحال جب بھی برطانوی ہند کو جلد یا بدیر نیم خودمختاری حاصل ہوگی تو نظام کو معاوضہ کے ساتھ وہ تمام زمین اور مقبوضات جو غصب کر لیے گئے تھے اپنی اصل حیثیت میں واپس ہوجائیں گی۔ اس بارے میں حیدرآباد کے مسلمانوں نے پہلے ہی ایک مطالبہ پیش کیا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کے طور پر مسلم لیگ کو مملکت حیدرآباد کی سالمیت اور آزادی کے لیے اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ کیوں کہ نظام کی یہ وسیع مملکت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مستقل طور پر بڑی تقویت کا باعث ہوگی۔

کسے معلوم ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند اپنے مفاد میں حیدرآباد کو کبھی مرکز اور قوت کا سرچشمہ بھی بنالیں، اس طرح یہ مسلم اثرات کا ایک تیسرا حصّہ ہوگا۔ دوسرے دو خطے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہوں گے۔ یہ تینوں مل کر ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط مثلث کی شکل اختیار کرلیں گے۔

(۱۰) کمیٹی نے ان امکانات کا جائزہ بھی لیا کہ وہ دیسی ریاستیں جو ان دو مسلم خطوں

کے متصل ہیں آیندہ چل کر آپس کے کسی مفاد کے لیے اتحاد بھی کر سکیں، اور اگر کبھی ایسا کوئی انتظام ہوا تو ان ریاستوں کی مندرجہ ذیل حیثیت ہوگی۔

شمالی مسلم خطّہ

وہ ریاست جو وفاق میں شامل ہوگی:	کل آبادی	مسلم آبادی
صوبہ سرحد کی ریاستیں:		
دیر، سوات اور چترال	۹،۰۲،۰۷۵	۸،۵۲،۰۰۰
بلوچستان کی ریاستیں:		
قلات	۳،۴۲،۱۰۱	۳،۲۱،۲۳۴
لسبیلہ	۶۳،۰۰۸	۶۱،۵۵۰
سندھ کی ریاستیں:		
خیرپور میرس	۲،۲۷،۱۸۳	۱،۸۶،۵۳۴
پنجاب کی ریاستیں:		
بہاول پور	۳،۸۴،۶۱۲	۷،۸۹،۱۷۶
کپورتھلہ	۳،۱۶،۷۵۷	۱،۷۹،۲۵۱
پٹیالہ	۱۶،۲۵،۵۲۰	۳،۶۳،۹۲۰
نابھہ	۲،۸۷،۵۷۴	۵۷،۳۹۳
وہ ریاستیں جو وفاق میں شامل ہو سکتی ہیں۔		
فریدکوٹ	۱،۶۴،۳۶۴	۴۹،۹۱۲
جیند	۳،۲۴،۶۷۶	۴۶،۰۰۲
مالیر کوٹلہ	۸۳،۰۷۲	۳۱،۴۱۷
لوہارو	۲۳،۳۳۸	۳،۰۱۹
پٹوڈی	۱۸،۸۷۳	۳،۱۶۸
دوجانہ	۲۳،۲۱۶	۵،۸۶۳
چمبہ	۱،۴۶،۸۷۰	۱۰،۸۳۹

مانڈی	۲،۷۰،۴۶۵	۶،۳۵۱
سکیت	۵۸،۴۰۸	۷۲۳
کلسیا	۵۹،۸۴۸	۲۱،۷۹۷
شملہ کی ریاستیں	۳،۳۰،۸۵۰	۱۰،۰۱۷
سرمور	۱،۴۸،۵۶۸	۷،۰۲۰
بلاس پور	۱۰،۹۹۴	۱،۴۵۸
کشمیر	۳۶،۳۶،۲۴۵	۲۸،۱۷،۶۳۶
کل ٹوٹل	۱،۰۰،۶۳،۵۴۰	۵۸،۳۶،۲۸۸

اگر یہ ریاستیں متحد ہوتی ہیں یا شمالی مسلم خطّے کے ساتھ وفاق بناتی ہیں تو مسلمانوں کا تناسب اس سارے خطے میں ۵۸ فیصد ہوگا۔ اگر بعض حالات کے تحت راجپوتانہ کی ریاستیں بیکانیر اور جیسلمیر کو بھی اس انتظام میں شامل کر لیا جائے تو اعداد و شمار یہ ہوں گے۔

ریاستیں	کل آبادی	مسلم آبادی
بیکانیر	۹،۳۶،۲۱۸	۱،۴۱،۵۶۸
جیسلمیر	۷۶،۲۵۵	۲۲،۱۱۶
ٹوٹل (مندرجہ بالا گوشوارے کے مطابق)	۱،۱۰،۷۶،۰۱۳	۵۹،۹۹،۹۷۲

مسلم آبادی کا تناسب ۵۵ فی صد بنتا ہے۔

تمام خطّے کی کل آبادی کا ٹوٹل بشمول برطانوی صوبے سندھ، بلوچستان، پنجاب و سرحدی صوبہ، دہلی اور مندرجہ بالا دیسی ریاستیں بیکانیر اور جیسلمیر کو شامل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل ہوگا۔

کل آبادی = ۳،۲۴،۳۶،۰۱۳

مسلم آبادی = ۲،۶۳،۲۰،۰۳۵

(ا) مسلمانوں کا تناسب ۶۰٫۰۶ فیصد

اگر اس میں بیکانیر اور جیسلمیر کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو صورت حال اس طرح تبدیل ہو جائے گی ؛

کل آبادی ۴،۲۴،۲۳،۵۴۰

مسلم آبادی ۲،۶۱،۵۶،۳۵۱

مسلمانوں کا تناسب آبادی ۶۱٫۶۳ فی صد

مشرقی مسلم خطّہ

(۱۱) مشرقی مسلم ریاست کے بارے میں مندرجہ ذیل متصلہ ریاستوں کو کوشش کر کے ایک فیڈریشن کی شکل دی جا سکتی ہے۔

بنگال کی ریاستیں

ریاست کا نام	کل آبادی	مسلم آبادی
کوچ بہار اور تری پورہ کی ریاستیں	۹،۷۳،۳۳۶	۳،۱۲،۴۷۶

مسلمانوں کا تناسب ۳۲٫۰۱ فیصد اور غیر مسلموں کا ۶۷٫۹۹ فیصد ہوگا۔

آسام کی ریاستیں

ریاست کا نام	کل آبادی	مسلم آبادی
منی پور اور کھاسی پہاڑیوں کی ریاستیں	۶،۲۵،۶۰۶	۲۴،۷۰۰

ان دیسی ریاستوں کو شامل کر کے مشرقی مسلم ریاست میں مسلمانوں کی حیثیت مندرجہ ذیل ہو گی ؛

کل آبادی ۵،۸۶،۱۰،۹۱۸

مسلم آبادی ۳،۱۲،۱۳،۵۹۷

غیر مسلم آبادی ۲،۷۳،۹۷،۳۲۱

مسلمانوں کا تناسب ۵۳٫۰۵ فیصد اور غیر مسلم تناسب ۴۶٫۰۵ فیصد ہوگا۔

(۱۲) اس انتظام میں خالص ہندو آبادی کا تعین کرنے کے لیے کمیٹی نے مندرجہ ذیل گوشوارہ تیار کیا ہے جو شمالی مسلم ریاست میں اقلیتوں کی حیثیت کو واضح کرتا ہے۔

برطانوی مقبوضات

صوبہ	کل اقلیتی آبادی	ذیلی فرقے	سکھ	عیسائی	ہندو	تناسب
پنجاب :	۱،۰۲،۴۸،۴۲۲	۱۲،۷۹،۴۵۹	۳۰،۶۴،۱۴۴	۴،۱۴،۷۸۸	۵۴،۹۰،۰۳۱	۲۳٫۰۲
		آبادی کے صحیح اعداد حاصل نہ ہو سکے۔				
سندھ :	۱۰،۵۶،۲۷۰	۴۰،۰۰۰	۱۸،۵۰۵	۱۵،۱۳۳	۹،۳۲،۶۲۳	۲۵٫۰۲
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۱،۹۷،۷۷۳	۵،۴۶۸	۴۲،۵۱۰	۱۲،۲۱۳	۱،۳۷،۵۸۲	۸٫۰۱
		آبادی کے صحیح اعداد حاصل نہ ہو سکے۔				
سرحدی قبائلی علاقہ برطانوی انتظام کے تحت	۵۰،۰۰۰	۱۰،۰۰۰	-	-	۴۰،۰۰۰	۲٫۰۹
بلوچستان :	۵۸،۰۰۰	۵،۷۲۲	۸،۳۶۸	۸،۰۴۴	۳۶،۰۶۵	۷٫۰۷
دہلی :	۴،۲۹،۲۸۶	۷۲،۸۸۳	۶،۴۳۷	۱۶،۹۸۹	۳،۳۲،۹۷۷	۵۲٫۰۰
کل :	۱،۲۰،۲۹،۷۵۱	۱۴،۱۳،۵۳۲	۳۱،۳۹،۹۶۴	۴،۶۷،۱۶۷	۷۰،۱۹،۲۷۸	۲۱٫۰۰

ان اعداد میں بہت چھوٹی اقلیتوں کی آبادی بھی شامل ہے جیسے بدھ، یہودی، جین، پارسی وغیرہ

دیسی ریاستیں

ریاست	کل اقلیتی آبادی	ذیلی فرقے	سکھ	عیسائی	ہندو (ان اعداد میں بہت چھوٹی اقلیتیں بھی شامل ہیں)	تناسب
دیر، سوات، چترال	۵۰،۰۷۵	اعداد	حاصل نہ ہو	سکے ۔	۵۰،۰۷۵	۵۶٫۵۴
قلات	۲۰،۸۶۷	〃	〃		۲۰،۸۶۷	۵۶٫۰۸
لسبیلہ	۱،۴۵۸	〃	〃		۱،۴۵۸	۲۶٫۰۲
خیرپور	۴۰،۶۵۱	〃	〃		۴۰،۶۵۱	۱۷٫۰۶
کشمیر	۸،۲۸،۶۰۹	۱،۷۰،۹۲۸	۵۰،۶۶۲	۲،۲۶۳	۶،۰۴،۷۵۶	۱۶٫۵۶

پنجاب کی ریاستیں

ریاست	کل اقلیتی آبادی	ذیلی فرقے	سکھ	عیسائی	ہندو (ان اعداد میں بہت چھوٹی اقلیتیں بھی شامل ہیں)	تناسب
پنجاب کی ریاستیں: پٹودی۔ دوجانہ، کلسیا اور شملہ کی ریاستیں	۳،۹۶،۹۴۲	۹۴،۳۴۷	۱۰،۸۵۴	۲۰۰	۲،۹۱،۵۴۱	۶۶٫۵۹
پنجاب اسٹیٹس ایجنسی:	۲۸،۸۸،۷۲۷	۳،۹۲،۹۹۹	۹،۹۶،۶۲۶	۴،۵۵۹	۱۴،۹۴،۷۴۵	۳۳٫۶۰
کل	۴۲،۲۷،۳۲۹	۶،۵۸،۲۷۴	۱۰،۵۸،۱۴۲	۷،۰۲۲	۲۵،۰۴،۰۹۳	۲۴٫۳۳

نوٹ:- اوپر دیئے ہوئے دو گوشواروں کے مطابق شمالی خطے کے علاقۂ زیر انتظام برطانوی حکومت میں خالص ہندو آبادی کا تناسب صرف ۲۱٫۰۶ فیصد اور مذکورۂ صدر پورے مسلم علاقے میں ۲۴٫۸۸ فیصد بنتا ہے۔

(۱۳) مشرقی مسلم ریاست میں اقلیتی آبادی کے اعداد و شمار ذیل کے گوشواروں میں دیئے گئے ہیں ؛

(الف) برطانوی بنگال میں غیر مسلم آبادی کی حیثیت کا تعین :

ہندو اور دوسری چھوٹی اقلیتیں	۱،۴۹،۹۹،۰۵۶	۲۹.۰۹ فی صد
ذیلی فرقے (ہریجن وغیرہ)	۶۸،۹۹،۸۰۹	۱۳.۰۷ فی صد
قبائلی آبادی	۵،۲۸،۰۳۷	۱.۰۵ ”
عیسائی	۱،۸۲،۱۶۶	—
سکھ	۷،۳۲۰	—

(ب) بنگال کی ریاستیں میں :

ہندو اور دوسری اقوام	۶،۳۰،۰۳۸	۶۴.۰ فی صد
ذیلی فرقے (ہریجن)	۳۰،۸۲۲	۳.۰ ”

(ج) برطانوی آسام میں :

ہندو اور دوسری اقوام	۳۱،۲۳،۲۷۴	۳۶.۶ ”
ذیلی فرقے (ہریجن وغیرہ)	۱۸،۲۹،۰۰۹	۲۱.۰ ”
قبائل	۷،۱۱،۴۳۲	۸.۲ ”
عیسائی	۲،۰۲،۵۸۶	۲.۵ ”

(د) آسام کی ریاستوں میں :

قبائل	۲،۸۰،۹۵۹	—
ہندو اور دوسری اقوام	۲،۷۳،۲۸۸	—
عیسائی	۴۶،۶۶۰	—

ان اعداد و شمار میں ان دو مسلم ریاستوں میں مختلف اقلیتوں کے عددی حیثیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

(۱۴) کمیٹی نے ان تجاویز کے دائرۂ کار میں شمالی اور مشرقی خطوں کے رقبے کے اعداد و شمار پر کام کیا تو مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئے ؛

مشرقی خطہ

برطانوی بنگال بشمول اضلاع بانکوڑا اور مدناپور:	۶۹،۶۵۱	مربع میل
آسام (برطانوی) :	۵۵،۰۱۴	"
بہار کا پورنیہ ضلع :	۴،۹۷۲	"
میزان :	۱،۲۹،۶۳۷	"
بنگال اور آسام کی ریاستیں :	۱۷،۷۵۴	"
کل میزان	۱،۴۷،۳۹۱	"

شمالی خطہ

برطانوی علاقے :

سندھ :	۴۶،۳۷۸	مربع میل
بلوچستان :	۵۴،۲۲۸	"
صوبہ سرحد :	۱۳،۵۱۸	"
قبائلی علاقے (زیر انتظام برطانیہ)	۱۱،۴۵۵	"
پنجاب :	۹۹،۲۰۰	"
دہلی :	۵۷۳	"
میزان	۲،۲۵،۳۵۲	"

ریاستیں :

بلوچستان کی ریاستیں :	۸۰،۴۱۰	"
سرحدی ریاستیں :	۱۱،۳۸۳	"
پنجابی ریاستیں :	۵،۸۲۰	"
پنجاب اسٹیٹس ایجنسی :	۳۱،۲۴۱	"
کشمیر :	۸۴،۵۱۶	"
میزان	۲،۱۳،۳۷۰	"

مشرقی خطے کا رقبہ :	۱۴۷،۳۹۱	مربع میل
شمالی خطے کے برطانوی علاقے کا رقبہ :	۲،۲۵،۳۵۲	〃
شمالی خطے کی ریاستوں کا رقبہ :	۲،۱۳،۳۷۰	〃
کل رقبہ :	۵،۸۶،۱۱۳	〃

(۱۵) کمیٹی نے اس اسکیم کے تحت آبادی کے اعداد کا ایک خلاصہ بھی تیار کیا ہے، جو یہ ہے :

ہندوستان کی کل آبادی =	۳۳،۸۱،۰۹،۳۶۳
مسلم آبادی =	۷،۹۳،۲۰،۰۰۹
مغربی اور مشرقی خطوں میں مسلم آبادی بشمول ریاستیں :	۵،۷۵،۳۳،۵۳۲
ان خطوں کی کل آبادی =	۱۰،۲۰،۴۶،۹۳۱

کمیٹی نے اس اسکیم کے تحت ان دونوں مسلم خطوں میں جس مسلم آبادی کو تحفظ فراہم کیا ہے اس کا تناسب ۷۲،۶۵ فی صد ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کی کل مسلم آبادی میں سے کمیٹی نے ۷۲،۶۵ فی صد مسلم آبادی کو ان دونوں خطوں میں تحفظ فراہم کر دیا۔

(۱۶) مسلم لیگ کی قرارداد لاہور اس بات کی طرف کوئی رہنمائی نہیں کرتی کہ جیسے ہی یہ مجوزہ ریاستیں وجود میں آئیں، فوراً ہی انھیں دفاع، خارجہ تعلقات، محصولات وغیرہ پر بھی اختیار حاصل ہو جائے گا۔ بحث طلب امر یہ ہے کہ تغیر پذیر عرصے کے دوران میں ان اختیارات کو کسی مشترکہ ایجنسی کے تحت عمل میں لایا جائے۔ رابطے کی ایسی مشترکہ ایجنسی کی ضرورت قرارداد کے تیسرے اصول کی بنا پر آزادی کے بعد بھی رہے گی۔ دونوں ریاستوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے والی مشترکہ تنظیم کے بغیر ہندو اثرات کے خطے میں اقلیت کے تحفظ والے اصول کا موثر طور پر اطلاق ناممکن ہوگا۔ ان وفاقوں میں سے ایک وفاق مسلمانوں کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا کیوں کہ مسلمانوں کو یہ ڈر ہوگا کہ ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر ان پر حاوی ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا مشترکہ انتظام کیا جائے اور قرارداد کے اصولوں پر بروئے کار لانے کے لیے کوئی ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کے ذریعے مرکز میں مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کے

برابر اختیار حاصل ہو جائے۔

ریاستوں کے باہمی تعلقات:

(۱۷) تمام علاقائی ریاستیں جنھیں اقتدار اعلیٰ حاصل ہو، اور تمام وہ ریاستیں جہاں شہزادگان کو مکمل اقتدار اعلیٰ حاصل ہو ان سب کو ایک معاہدے کے تحت ایک مشترکہ انتظامیہ قائم کرلینا چاہیے تاکہ وہ اُن ریاستوں کی طرف سے وہ اہم اور خاص امور جو طے شدہ ہوں اور جنھیں انجام دینے کے اسے اختیارات تفویض کیے جائیں وہ انھیں انجام دے سکے۔ ان کے علاوہ؛

(الف) بقیہ تمام اختیارات اس ریاست کو عطا کر دیے جائیں۔

(ب) طے شدہ امور کے سوا تمام امور اس ریاست کی حکومت انجام دے جیسا کہ اس ریاست میں ہوتا آرہا ہے۔

(ج) اور اس کی انتظامیہ اور مختلف کمیٹیوں میں مسلمانوں کو کم از کم نصف نشستیں حاصل ہوں۔

اس مرکزی کمیٹی یا مشترکہ انتظامیہ کو یہ امور تفویض کیے جائیں۔

(الف) خارجہ تعلقات (ب) دفاع (ج) مواصلات (د) محصولات (ہ) اقلیتوں کا تحفظ اور رضاکارانہ داخلی تبادلۂ آبادی۔

دفاع:

(الف) ہر مشتملہ ریاست اپنے اخراجات پر اپنی فوج رکھے گی۔ اس کی تعداد کا انحصار معاہدے میں طے شدہ اس کی اپنی دفاعی حیثیت پر ہوگا۔ مرکز ہر ریاست کے مذکورہ فوجی قوت کے اخراجات میں حصہ بٹائے گا۔ عام حالات میں ہر ریاست کی فوجی قوت اس کے اپنے محکمہ دفاع کے ماتحت ہوگی مگر مرکز (مشترکہ انتظامیہ یا مرکزی کمیٹی) اس پر نگہداشت رکھے گا۔ مگر حالت جنگ میں وہ کلی طور پر مرکز کے اختیار میں ہوگی۔

(ب) بحریہ مکمل طور پر (مرکزی) انتظامی کمیٹی) کے ماتحت ہوگی۔ سوائے ان

چند مراعات کے جن کی ان ریاستوں کو ضرورت ہو جن کا ساحل ہو۔

(۱۸) مرکزی انتظامیہ کا یہ کام بھی ہو کہ ان ریاستوں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ریاست کے اندر یا ایک ریاست سے دوسری ریاست میں تبادلۂ آزادی کے موقع پر ضرورت کے مطابق اُن میں تحفظ کا احساس پیدا کرنا۔ اس مقصد کے لیے ہر ریاست ضروری قانون بنائے گی اور ایک ایسی انتظامیہ بنائے گی جو اس تبادلۂ آبادی کو منظم اور مربوط طریقہ سے کامیاب بنائے۔ اور کسی بھی صورت میں تارکین کی پیچھے چھوڑی ہوئی ساری جائیداد کا معاوضہ ادا کرے۔

اقلیتوں کے لیئے تحفظ :

(۱۹) اقلیتوں کے تحفظ کے سوال پر جو ان خیالات کا آخری نکتہ ہے کمیٹی کی رائے ہے کہ جب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی ان ریاستوں کو وجود میں لاتے اور ان کے آپس کے تعلقات کے بارے میں غور و خوض کرے تو اس نکتے پر خاص توجہ کے ساتھ غور کیا جائے۔

(۲۰) کمیٹی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس انتظام میں اقلیتی صوبوں کے جو مسلمان بکھری آبادی کی صورت میں رہ رہے ہیں انھیں بھی ایک آزاد وطن مہیا کیا جائے۔ جہاں وہ پہلے ہی اکثریت میں ہیں یا ایک ایسا خطہ جہاں مسلمان ترک سکونت کر کے رفتہ رفتہ اپنی اکثریت قائم کر لیں ؟

کمیٹی کے سامنے ایک تجویز یہ آئی کہ یو پی کے مسلمانوں کے لیے ایسا سکونتی خطہ روہیل کھنڈ ڈویژن کے پانچ اضلاع یعنی بریلی، بجنور، بدایوں، مراد آباد اور شاہجہان پور کے علاوہ سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ اور بلند شہر نیز آگرہ ڈویژن میں سے صرف علی گڑھ میں ایسا خطہ مہیا کیا جائے۔ کمیٹی نے اس تجویز کا جائزہ لے کر محسوس کیا کہ اس علاقے کی کل آبادی جو ۱۰۰۹٫۵۵٫۲۹۷ ہے۔ اس کے برعکس مسلم آبادی ۲۵۸۲٬۶۴٬۲۷ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲۵ فی صد مسلم آبادی کے خلاف ۷۵ فی صد آبادی کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔ لہٰذا یہ تجویز عملی طور پر مایوس کن قرار دے دی گئی۔

پھر انہیں خطوط پر کمیٹی کے سامنے بہار میں مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا مائیگریشن

زون یا سکونتی خطہ قائم کرنے کا سوال اٹھایا گیا۔ کمیٹی نے اس تجویز کا بھی بغور جائزہ لیا کہ بہار کے اضلاع بھاگل پور، دربھنگہ، سنتھال پرگنہ، مظفر پور، چمپارن، سارن اور پٹنہ اور ان کے علاوہ یوپی کے متصلہ اضلاع گورکھپور اور بستی کو ملا کر مستقبل میں مسلمانوں کے ترک سکونت کے لیے ایک مسلم خطہ بنا دیا جائے۔ مگر یہ تجویز بھی ناقابل عمل پائی گئی کیوں کہ اس خطے کی کل آبادی کے اعداد و شمار ۲،۲۵،۶۶،۹۴۱ تھے جب کہ اس کے مقابلے میں مسلم آبادی صرف ۲۹،۰۴،۵۴۰ تھی۔ مسلمانوں کا تناسب ظاہر ہے بہت ہی کم یعنی صرف ۱۳ فی صد تھا۔

آخر میں کمیٹی نے اسی طرح کی تیسری تجویز یعنی مدراس پریسیڈنسی میں جنوبی کنارا اور مالا بار ضلعوں کو ایسے مسلم خطہ میں تبدیل کرنے کا جائزہ لیا۔ مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان اضلاع میں مسلم اور غیر مسلم آبادی کا اختلاف مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوگا:

مسلم آبادی = ۱۳،۴۲،۶۶۳

کل آبادی = ۴۹،۰۶،۱۸۵

مسلمانوں کا تناسب ۱۳ فی صد

کمیٹی نے حاجی عبدالستار اسحاق سیٹھ۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکز۔ مسلم نمایندہ مدراس) اور نواب صدیق علی خاں۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکز۔ مسلم نمایندہ صوبہ متوسط) سے بھی مشورہ کیا۔ ان معزز اشخاص کے ساتھ کافی بحث و مباحثہ کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہ حضرات بھی اس مشکل صورتِ حال کا کوئی حل تجویز نہیں کر سکے۔

(۲۱) مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ یہ رپورٹ مسئلے کی کوئی واضح تصویر (اور قطعی حل) پیش کرتی ہے البتہ اس خاکے سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کمیٹی اپنے غور و فکر کے نتائج کو آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے حمایت کا مستحق سمجھتی ہے۔

مجھے آپ کی خدمت گزاری کا شرف حاصل ہے۔

آپ کا مخلص خادم

(شرح دستخط) عبداللہ ہارون

(چیئرمین خارجہ کمیٹی۔ آل انڈیا مسلم لیگ)

Napier Road,
Karachi, 23rd December 1940.

From,

Haji Sir Abdullah Haroon, Kt., M.L.A.
Chairman Foreign Committee All India Moslem
League, Napier Road, Karachi.

To

The President,
All India Moslem League,

Sir,

I have the honour to state as follows:-

1. That in February this year the Foreign Committee had issued an invitation to the authors of the various schemes of Constitutional Reform for India, to meet together, under the auspices of the said Committee, in order to examine jointly each such scheme and see whether a consolidated scheme can be finally framed. That invitation was promptly accepted by all the authors, who formed themselves into a Committee and assembled at Delhi, first, in February last and then again in November last. In the first sitting only figure work was done and in the second meeting the main principles were laid down. In the following pages are given the findings of, and the result of the investigations conducted by, the said Committee of authors.

2. That the following gentlemen constituted the Committee alluded to in the preceding para:-

1. Sir Haji Abdullah Haroon, Kt., M.L.A. (Central)
2. Moulana Ghulam Rasool Meher, Editor "Inquilab" Lahore.
3. Nawab Sir Shah Nawaz Khan of Mamdot.
4. Mr. Rizwanullah, M.L.A.
5. Dr. Afzal Hussain Kadri, M.A., Ph.D.
6. Dr. Sayed Abdul Latif, Ph.D.
7. Choudhry Akhtar Hussain M.L.C.

8. Mr. A. Punjabi,

9. Sayed Ali Muhammad H. Rashdi (Secretary)

3. That the arguments in support of the plan, embodied in the following pages, have not been touched for the present. That part of the work has been assigned to Moulana Ghulam Rasool Meher and Mr. Rashdi who are expected to produce a booklet on the subject for general public consumption. In this report only that material has been given which pertains to the scheme as such. If the All India Moslem League accepts the findings then the arguments can be produced and published.

4. The Commitee formed as the basis of its consideration the Resolution adopted by the All India Moslem League at its last Lahore Session. Obviously this Resolution had been framed by the working Committee in the light of the outline placed in your hands by me in the shape of a small Memorandum in February last. The Resolution as it finally emerged out of the Session enunciated a few basic principles which had to under-lie every constitutional plan which might be devised for British India. The task before the Committee was not merely to suggest a menthod whereby the principles so laid down by the Resolution might be implemented, but to see in what manner the League plan could cover the future of Muslims in non-British India as well, for the Committee felt that no Constitutional plan for the nine crores mussalmans of India would be complete without bringing the question of the Moslems in the Indian States within its purview. The plan suggested below is thus fuller than the one revealed in the said Resolution. The Committee hope that it will be borne in mind that the reccommendations made to the extent set-forth hereunder all fall within the four corners of the Lahore Resolution and are intended just to give a shape to the provision only broadly indicated therein.

5. That the Lahore Resolution laid down three principles:

(a) The British India should resolve itself into regions formed of contiguous parts through such territorial readjustments as may be necessary so that the areas in which the Muslims are numerically in a majority as in the North Western and Eastern zones of India should be grouped to constitute "independent States" in which the constituent units shall be autonomous and sovereign.

(b) That these regional states shall assume finally "all powers such as defence, external affairs, communications, customs and such other matters as may be necessary".

(c) That "adequate effective and mandatory safeguards should be specifically provided in the constitution for minorities."

6. that the Committee has very carefully examined the distribution of population in India and found that although the Muslims were un-methodically dispersed all over the land yet there existed areas where Muslim States could conveniently be established, in view of the fact that the Moslems formed the majority of the population therein. The Committee have examined the position of such areas and have recommended that one Moslem State can be formed in the North West and the other in the North East. It might be stated that the moslem percentages that can be secured under this arrangement would be in the vicinity of 83% in the North West and 54% in the North East.

7. that with regard to the Moslem State in the North West I am to state that the Committee have made the following observations:-

N.W. STATE.

"Having regard to the principle involved that the state to be formed should be composed of territories contiguous to each other, and at the same to the sad fact that even in this area the Muslims are not evenly distributed and that it is intersected by small native states which cannot be absorbed except in a federal sense, the committee has come to the conclusion that the present provinces of Sind, British Baluchistan, N.W.F.P. and the Punjab should be grouped together to constitute a federal soverign state with the Delhi province amalgamated with the Punjab, in view not merely of its racial and cultural afinity with it but because of its long historic connections with Muslim life. The idea has been suggested to extend the Eastern boundry of the Punjab to cover a small area of U.P., so as to let the great centre of Muslim culture, namely, Aligarh, form part of this main Muslim zone, but how the percentage of Muslims in the Punjab will be affected by the inclusion of this small strip from U.P. has not been worked out. A note about it may follow at an early date. The figures will work out as follows:-

NORTHERN MOSLEM ZONE.

POPULATION FIGURES (1931)

MOSLEM POSITION.

Province	Total population	Moslem population
Punjab	2,35,80,332	1,33,32,460
Sind	33,87,070	23,30,800
N.W.F.P. (Settled	24,25,076	22,27,303
Do (Tribal area administered by British	13,67,231	13,17,231
British Baluchistan	4,63,503	4,05,309
Delhi Province	6,36,246	2,06,960
Total	3,23,60,013	2,03,20,063

EXPLANATION.

1. These figures indicate the position of Moslems within the British territory in the Northern zone including Delhi. The Moslem percentage of population within this zone works out at 62.75."

With regard to the other State, in the North East, the

Committee are of the view that it should include the present provinces of Assam and Bengal (excluding Bankura & Midnapur districts) and the district of Puranea from Behar whose population is racially and culturally akin to that of Bengal.

The figures of this area are as follows:-

Total Population	5,70,11,346		
Moslems	3,03,76,421	percentage	54
Non-Moslems	2,61,34,525	do	46

Among the non-moslems, roughly about 35,00,000, i.e. 32% of Non-Moslem population are members of the scheduled classes, about 15,00,000 i.e. 6% are Tribals and about 4 lakhs are Christians.

9. It has been suggested above that although the Lahore Resolution is primarily influenced in its plan by the needs of Muslims in British India, the Committee deems it a duty to point out that even in their own interests as of the rest of the Muslims, it would be desirable to conserve and perpetuate the Muslim influence wherever it predominates in any form in non-British India. Hence it is that all the native states large or small ruled by Muslim Princes should be regarded for purposes of the Muslim constitutional plan as soverign Muslim States. This must be made a basic demand. Of such Muslim states, Hyderabad with its vast territory is not a fendetory or creation of the British Government in the sense every other native state whether Muslim or Hindu is. It is an independent State in its own inherent and historic rights, with whom the British Government have entered into treaties for mutual benefit as allies, and is indeed the soverign

of various territories held by the British as Inam Jagirsek obligation to discharge certain military duties for the Nizam. when British India is to attain dominion Status sooner or later the Nizam will return to the status quo with all his Muaxiza lands wrongly styled ceded territories returned to him. Indeed a demand to this effect has already been made by the Muslim

of the Dominions of Hyderabud. It would be appropriate that the League should concentrate its aim on the independence and integrity of expanded dominion of the Nizam as it will be source of infinite strength to the Muslims in India outside of the dominions. Who knows that in the fullness of time the Muslims of India might find it to their advantage to make Hyderabad their rallying point and the centre of their growing strength.

This will in this way be the third wide sphere of Muslim influence- the other two being those in the N.W. and the North East. The three forming a tiangular strenghold of the Muslims of India.

10. The Committee have also examined the possibilities of Native States adjacent to the two Moslem States federating with the latter for some common purposes. Should any such arrangement be ever made the position would be as follows:-

<u>Northern Moslem Zone.</u>

States which may federate	Total Population	Moslem Population
Frontier States (Dir, Swat & Chitral)	9,02,076	8,52,000
Baluchistan States Kalat	3,42,101	3,21,234
Las Bela	63,008	61,550
Sind States (Khairpur Mirs)	2,27,183	1,96,532
Punjab States		
Bahawalpur	3,84,612	7,99,176
Kapurthala	3,16,757	1,79,251
Patiala	16,25,520	2,63,920
Nabha	2,87,574	57,393
Faridkote	1,64,364	49,912
Jind	3,24,676	46,002
Malerkotla	83,072	31,417
Loharu	23,338	3,019
Pataudi	18,873	3,163
Pujana	23,216	5,363
Chamba	1,46,870	10,839

Mandi	2,70,465	6,351
Suket	53,408	733
Kalsia	59,848	21,797
Simla Hill States	3,30,850	10,017
Sirmur	1,43,563	7,020
Bilaspur	10,994	1,458
Kashmir	36,36,245	23,17,636
Total	1,00,63,540	53,36,283

If these States federate or confederate with the Northern Moslem Zone the percentage of the Moslems within that entire zonal arrangement would be 53%.

If for certain considerations the Rajputana States of Bikaneer and Jaisalmeer are also included in this arrangement the figures would be as follows:-

States.	Total Population	Moslem Population.
Bikaneer	9,36,218	1,41,563
Jaisalmeer	76,255	22,116
Total (Figures given in the above table are included)	1,10,76,013	59,99,372

The percentage of the Moslem population would stand at 55%.

Following is the grand total of the whole population within the entire Northern Zone comprising of the British Province of Sind, Baluchistan, Punjab, N.W.F.P., Delhi and the Native

States mentioned above, Bikaneer and Jaisalmeer included:-

Total Population	3,34,36,013
Moslem Population	2,63,20,035

Moslem Percentage 60.08.

If Bikaneer and Jaisalmeer are excluded the position will stand as follows:-

Total population	4,24,23,540
Moslem Population	2,61,56,351

Moslem percentage 61.63.

11. In case the Eastern Moslem State the following adjoining States can be persuaded to federate:-

BENGAL STATES.

Name of State	Total Population	Moslem Population
Coach Behar Tripura States.	9,73,336	3,12,476

Moslem percentage would stand at 32.1. and the non-moslem percentage at 67.9.

ASSAM STATES.

Name of States	Total Population	Moslem population
Manipur and Khals Hill States.	6,25,606	24,700

These Native States included, the position of the Eastern Moslem States would be as follows:-

Total Population	5,86,10,913
Moslems	3,12,13,597
Non-Moslems	2,73,97,321

The percentage of the Moslems would stand at 53.5 and of the non-moslems at 465.

12. In order to ascertain the position of Caste-Hindus within this arrangement the Committee have prepared the following table which indicate thes the position of the minorities in the Northern Moslem State:-

(1) British Territory.

Province	Total Minority population	Scheduled Castes	Sikhs	Christians	Hindus	
					*Population	Persentage.
Punjab	1,02,43,422	12,79,459	3064,144	4,14,733		
	Exact figures not available.				54,90,031	23.2
Sind	10,56,270	40,000	18505	15,133	9,32,623	25.2
N.W.F.P.	1,97,773	5,468	42,510	12,213	1,37,532	3.1
	Exact figures not available.					
Do Tribal area admin: Britain	50,000	10,000			40,000	2.0
Baluchistan	53,000	5,723	3,363	4,044	36,065	7.77
Delhi Pr.	4,29,236	72,833	6,437	16,089	3,32,977	52.02
Total	1,20,39,950	14,13,532	31,33,904	4,67,107	70,20,237	21.06

*This figure includes the population of smaller minorities such as Budhist, Jews, Jains and Parsees.

NATIVE STATES.

State	Total Minority Population	Scheduled Castes	Sikhs	Christians	Hindus. (These figures included small minorities also.	
					Population	Percentage.
Dir, Swat Chitral	50,075	----No figures available.			50,075	5.54
Kalat	20,367	do			20,367	5.03
Las Bela	1,453	do			1,453	2.02
Khairpur	40,651	do			40,651	17.05
Kashmir	3,23,609	1,70,923	59,662	2,263	6,04,756	16.56
Punjab States Pataudi) Dujana) Kalsia) Simla) States)	3,06,942	94,347	10,354	200	3,91,541	66.59
Punjab States Agency	23,33,727	3,92,999	9,96,626	4,557	14,94,745	33.60
Total	42,27,3[illegible]	6,53,274	10,53,142	6,322	25,04,991	24.83

10.

(NOTE: According to the figures given in the preceding two tables the total strength of the caste Hindus in the British territory in the Northern zone, is 21.06 only and within the aforesaid States their percentage is 24.83 only.)

13. The position of the minorities within the Eastern Moslem State is indicated by the following tables:-

(a) Position of Non-Muslim Population in British Bengal.

		Percentage.
Hindus & other small minorities.	1,49,93,056	23.9
Schedule classes.	63,33,303	13.7
Tribal population.	6,23,037	1.5
Christians.	1,32,166	———
Sikhs.	7,320.	

(b) In Bengal States:

Hindus & others.	6,30,033	64.0
Scheduled classes.	30,322	3.0

(c) In British Assam:

Hindus & others.	31,23,274	36.6
Scheduled classes.	18,29,009	21.0
Tribals.	7,11,432	8.2
Christians.	2.02,536	2.5

(d) In Assam States:

Tribals.	2,30,359
Hindus & Others.	2,73,233
Christians.	46,660

These figures indicate the numerical strength of of various minority communities within the various units in the two Moslem States.

14. The Committee worked out the figures of area in respect of Northern and Eastern zones covered by their proposals. The results were as follows:-

E A S T E R N   Z O N E.

British Bengal excluding Bankura and Midnapur Districts.	69,651	Sq.miles.
Assam (British)	55,014	-do-
Purnea District of Bihar	4,972	-do-
	1,29,635	Sq.miles.
Bengal and Assam States.	17,764	-do-
Grand Total.	1,47,397	Sq.miles.

NORTHERN ZONE.

British territory:

Sind.	46,373	Sq.miles.
Baluchistan.	54,223	-do-
Frontier Province.	13,513	-do-
Tribal Area(administered by British).	11,455	-do-
Punjab.	99,200	-do-
Delhi.	573	-do-
Total.	2,25,352	Sq.miles.

States:

Baluchistan States.	80,410	sq.miles.
Frontier States.	11,333	-do-
Punjab States.	5,320	-do-
Punjab States Agency.	31,241	-do-
Kashmir,	84,516	-do
Total;	2,13,370	Sq.miles.

Grand total of Northern zone States & British territory combined.	4,45,072 Sq.miles.
Total area of both the zones.	5,32,463 Sq.miles.

15. The Committee has prepared an abstract of the population figures covered by their plan, which is as follows:-

Total population of whole India.	33,81,09,363.
Moslem population.	7,93,20,009
Moslem population within the Western and Eastern Moslem Zones, States included.	5,75,33,532,
Total population within these zones.	10,20,46,331.

The percentage of the Moslem population to which the Committee has been able to give protection under the scheme of constituting these two Moslem zones is 72.5. In other words out of the total Moslem population in India the Committee has protected about 72.5 per cent. of them by these proposals.

16. The Lahore resolution of the League does not look forward to the proposed regional states assuming immediately

as they are formed powers of defence, external affairs, custom etc. This argues that there should be a transitional stage during which these powers should be exercised by some agency common to them all. Such a common co-ordinating agency would be necessary even independent of the above consideration, for, under the third principle of the resolution, it will be impossible to implement effectively the provision of safeguards for minorities without some organic relationship subsisting between the states under the Hindu influence. A federation is not to the taste of the Muslims, because they fear that the Hindus will, on the strength of their majority, dominate the Moslems. But since some common arrangement is essential to the fulfilment of the provisions of the resolution, an agreed formula has to be devised whereby the Moslems shall have the control at the Centre on terms of perfect equality with the Non-Muslims.

<u>Inter-relation between States:</u>

17. All the regional States designated " Sovereign" and all the States under Princes being restored to their full sovereignty should in free agreement enter into a joint pact to have a common agency to look after in the name of all the component States, certain specified subjects delegated to it being specifically stipulated:-

(a) that all the residuary powers shall vest in the individual States.

(b) that the delegated subjects except in cases otherwise provided shall be administered by the Governments of the individual States in so far as they pertain to their State areas.

(c) And that both on its Executive and other bodies, the Moslems shall have half the seats.

The subjects to be assigned to this central machinary shall be (a) External relation, (b) Defence, (c) Communications, (d) Customs, (e) Safeguards for minorities and voluntary intermigration etc. subject to the following provisos in respect of defence and intermigration:-

DEFENCE:

(a) Each component State shall maintain an Army at its own expense, the strength of which will be dependent on the importance of its strategic position and specified in the compact. The Centre will share the military expenditure of each State according to the strength of the Army maintained. In normal times the military force in each State will be controlled by its own Military Department and supervised by the Centre. But in times of War, full control will be assumed by the Central Agency.

(b) The Navy will be entirely under the control of the Centre subject to such concessions as the Coastal States might need.

18. One of the functions of the Central machinary shall be to facilitate intermigration of Moslems and Hindus wherever sought and wherever necessary, between States or between parts of the same State so as to Promote a sense of security among them. For this, the necessary legislation shall be passed for each State, and a machinary will be set up to organise and regulate such migration and assign compensation for property in all forms left behind by migrants.

SAFEGUARDS FOR MINORITIES.

19. In respect of the question of safeguard of minorities which was the last item under consideration, the Committee thought that this item might be profitably considered only when the principles indicated above in respect of the formation of regional States and their inter-relation are considered by the Working Committee of the Moslem League.

20. The Committee tried to find out if it was possible to make some arrangement for the Moslems scattered in the minority Provinces, whether by providing them with independent homelands already having Moslem majority, within

those provinces, or by arranging some migratory zones to which the Mussalmans may migrate and thus form a majority in due course of time. A proposal was put forth before the Committee that for U.P. Mussalmans a migratory zone be provided by taking up the 5 districts of Rohilkhund division namely Barreily, Bijnore, Badaun, Moradabad and Shahjehanpur, Muzzaferpur, Meerut and Bulandshahr, and from the Agra Divs. the only district of Aligarh. The Committee examined the position and found that the figure of total population within this combination stood at 1,09,65,397 as against the Moslem population of 27,64,253, which meant that for the sake of 25% Moslem we would be creating complications for 75% population. This plan for practical reasons was considered hopeless.

Then, along the same lines, the Committee went into the question of having a Migratory zone somewhere in Bihar. The Committee examined the proposal of converting the Bihar districts of Bhagalpur, Darbhanga, Santlal Pargana, Muzapur, Champaran, Saran and patna as well as the adjoining districts of Gorakhpur and Basti in U.P. into a Moslem zone for purposes of migration in the future. But that proposal also was found unworkable in so far as the figure of total population within that zone stood at 2,25,66,941 whereas the Moslem population was only 29,04,540. The Moslem percentage was obviously so low as only 13%.

Lastly the Committee analysed the third proposal of similar nature in respect of the conversion into a Moslem zone of the Districts of South Kanara and Malabar in the Madras Presidency, but that also did not entail any hopeful results. The difference between the Moslem and Non-Moslem population in those Districts would be reflected by the following figures:-

Moslem population. 13,43,663.

Total population. 49,06,135.

The Moslem percentage being 13 %.

The Committee consulted Seth Haji Abdul Sattar Ishak Sait M.L.A.(Central), as a representative of the Madras Moslems and Nawab Siddik Ali Khan M.L.A.(Central) as representing the viewpoint of the C.P.Moslems.Protracted discussion with those gentlemen did not,however,alter the position in any,nor could they offer any suggestion for getting over this difficulty.

21. I do not claim that this report presents a complete picture of the whole thing. The outline needs lot of amplification but that the Committee can conveniently do should its conclusions find favour with the working Committee,All India Moslem League.

I have the honour to be

Sir,

Your most obedient servant,

CHAIRMAN,
FOREIGN COMMITTEE,ALL-INDIA MOSLEM LEAGUE.

ضمیمہ : ۲

قرارداد لاہور اور پاکستان اسکیم

ذیل میں سر محمد یامین خاں کی خود نوشت "نامۂ اعمال" سے قرارداد لاہور کے بارے میں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ ہمارے موضوع کی چند باتوں پر اس سے روشنی پڑتی ہے؛

۱۔ قرارداد لاہور کی ترتیب کے وقت مسلم لیگ کے سامنے پنجاب و بنگال اور ان کے اضلاع میں ہندو مسلم آبادی کے وہی اعداد و شمار تھے جو مسلم لیگ کی خارجہ کمیٹی کی ذیلی کمیٹی نے فراہم کیے تھے اور ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۲۔ چوں کہ "پاکستان اسکیم" میں پیش کردہ اعداد و شمار قابل اعتماد نہیں تھے، اس لیے مسلم لیگ کے صدر نہیں چاہتے ہوں گے کہ اس اسکیم کو مسلم لیگ کی جانب سے پیش کر کے ایک نئی بحث پیدا کر دی جائے۔

۳۔ پاکستان اسکیم میں اعداد و شمار درج کیے گئے ہیں لیکن حوالہ نہیں دیا گیا کہ آیا وہ کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں؟ اس کے مرتبین نے یقیناً کئی ماخذوں سے استفادہ کیا ہوگا اور اپنے مفید مطلب اعداد و شمار حاصل کر لیے ہوں گے۔ جب کہ سر محمد یامین خاں نے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے جو اس وقت تک مردم شماری کی آخری رپورٹ تھی، اعداد پیش کیے ہیں۔ محمد یامین خاں کے نزدیک یہ اعداد قابل اعتماد ہیں۔

ابو سلمان شاہجہاں پوری

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء - صبح لاہور پہنچا - اسٹیشن پر نواب زادہ رشید علی خاں لینے آئے تھے ان کے یہاں گیا - ان کی میم صاحبہ جو بلجینی تھیں خوب اردو بولنے لگی ہیں - ہر سال شملہ پر ان سے ملاقات رہتی ہے - سر سکندر حیات خاں کا خط جو میرے ۵ مارچ کے خط کے جواب میں ہے یہاں ملا - میں نے خاکساروں پر پابندیاں لگانے پر اعتراض کیا تھا اس کا جواب ۱۸ مارچ کو لکھا کر یہاں بھیج دیا - نواب اسمٰعیل خاں ایک دن پہلے سے ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں - انھوں نے ڈیرے لگوائے ہیں جن میں مہمان ہیں - ناشتہ کے بعد میں اور نواب اسمٰعیل خاں ہسپتال گئے جہاں بہت خاکسار زخمی پڑے ہیں ان پر پولیس اور فوج نے ۱۹ مارچ کو فائرنگ کی ہے - سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب نے لاہور میں پریڈ کرنے کو منع کیا تھا اس کی خلاف ورزی میں خاکساروں نے پریڈ کا جلوس نکالا، سر سکندر نے فائرنگ کرادی - میں سب زخمیوں سے ملا اور ان کو دلاسا دیا اور کہا کہ میں ان کی بابت اسمبلی میں سوال اٹھاؤں گا - ان کی دلجوئی کرنے کے بعد میں سر سکندر حیات خاں کے پاس گیا . . . . . میں نے کہا کہ جو لوگ مرے یا زخمی ہوئے ان کی اور ان کے ورثاء کی مالی امداد فوری ضروری ہے اور کل آپ کے یہاں لیگ کا جلسہ ہے اس میں لوگ باگ آپ کو بُرا نہ کہیں اس لیے آج ہی کچھ نہ کچھ انسداد کر دیجیے - سر سکندر نے وعدہ کیا کہ جس وقت خاکسار با امن ہو جائیں گے ہم ان کی مدد کریں گے - اور جو لوگ زخمی ہوئے یا مارے گئے ان کے ورثاء کو معاوضہ دیں گے -

وہاں سے چل کر پنڈال دیکھا جہاں کل دن میں اور آج رات کو جلسہ ہوگا - نوابزادہ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے سیکرٹری ہیں اور بہت اچھا کام کر رہے ہیں - پہلے تو ان کا مسٹر جناح سے اختلاف رائے تھا چوں کہ مسٹر جناح ایک سازشی گروہ کے ہاتھ میں پڑ گئے تھے لیکن اب وہ کسی قدر واقف ہو گئے ہیں حالانکہ اب بھی ان لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں - لیاقت علی خاں بڑے رئیس ہیں، اور ان کے یہاں نواب کا خطاب پشتینی ہے جو ان کے بڑے بھائی سجاد علی خاں کو ملا ہے جن سے دربار میرٹھ میں میری ملاقات ہوتی رہتی ہے - لیاقت علی خاں بہت خود دار ہیں اور ریاست

کا بھی زعم ہے پہلے تو کانگریسی خیالات کے تھے اور انتخاب مشترکہ کے حامی تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہندو کاشتکار اسی طرح ووٹ دیں گے جس طرف ہم زمیندار کہیں گے۔ میں ہر طرح سمجھاتا تھا لیکن نہ مانتے تھے میرے دوست مسٹر عبدالباری بیرسٹر میرٹھ جن کو میں نے میرٹھ۔ علی گڑھ اور آگرہ سے صوبائی اسمبلی کا ممبر بنوایا تھا ان کی بڑی دوستی نواب زادہ لیاقت علی خاں سے تھی وہ بھی سمجھاتے تھے مگر یہ نہ سمجھتے تھے لیکن گذشتہ صوبائی الیکشنوں نے آنکھیں کھول دیں کہ کاشتکار اب زمیندار کے دباؤ میں نہیں رہے بلکہ زمیندار کو دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ بلامقابلہ ممبر ہو گئے، اور خلیق الزمان کی ٹولی کسی کو ان کے مقابلے پر کھڑا نہ کر سکی تاہم یہ سمجھ گئے کہ اب مسلمانوں کا لیڈر ہونا چاہیے نہ کہ کاشت کاروں پر بھروسہ کرنا۔ پنڈال مسلم لیگ نے خوب بنوایا۔

ڈنر کے بعد سبجکٹ کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں کل ممبران آل انڈیا مسلم لیگ کونسل شریک ہوئے۔ میرے ایک طرف سر سکندر حیات خاں بیٹھے تھے دوسری طرف خان صاحب شیخ رشید احمد آرمی کنٹریکٹر۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ریزولیوشن بن گیا ہے وہ صاف ہو رہا ہے اور ٹائپ ہو کر آئے گا اور اپنی تقریر میں دو قوموں کی تھیوری بتائی . . . . . جب مسٹر جناح نے تقریر ختم کی تو کہا کہ آپ سب اس پر سوچ کر رائے دیں۔ خان صاحب شیخ رشید احمد کھڑے ہوئے اور کہا حضور ہم تو آپ کو لیڈر مان چکے اب آپ جو کہیں گے ہم اُس کو آنکھیں بند کر کے منظور کریں گے۔ مسٹر جناح نے بہت ڈانٹ کر کہا کہ آپ لوگ تمام ہندوستان سے اس لیے آئے ہیں کہ اپنی اپنی رائے دیں نہ کہ اس لیے کہ جو میں کہوں اس کو آنکھیں بند کر کے منظور کریں۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو میں اپنی رائے اخبار میں شائع کرا دیتا اور آپ منظور کر لیتے۔

اتنے میں ریزولیوشن ٹائپ ہو کر آ گیا اور رات کے دو بج گئے۔ میں جناح صاحب کے قریب جا بیٹھا اور لمبے ریزولیوشن کو سُنا لیکن اس کی اہمیت کو ٹھیک نہ سمجھ سکا۔ ہر صوبہ کو ایک ایک کاپی دی گئی کہ وہ آپس میں مشورہ کر لیں۔ ہمارے صوبہ کی کاپی نواب صاحب چھتاری لے گئے کہ وہ پڑھ کر صبح کو نو بجے پنڈال میں

لے آئیں گے چونکہ مسٹر جناح نے کہا کہ وہ صبح کو ساڑھے نو بجے پھر سبجکٹ کمیٹی کریں گے۔ میں نو بجے گیا لیکن نواب صاحب چھتاری ساڑھے نو بجے پھر سبجکٹ کمیٹی کو اٹینڈ کرنے آئے، اور نواب سر محمد یوسف سے مشورہ کے بعد چند ترمیمات ریزولیوشن میں مجھ کو دکھائیں۔ میں ان کو یا ریزولیوشن کے الفاظ کو ٹھیک نہ سمجھ سکا تھا کہ مسٹر جناح آ گئے اور کارروائی شروع ہوئی۔

نواب صاحب چھتاری نے اپنی ترمیمات پیش کیں مسٹر جناح نے کہا کہ کوئی ان کی تائید کرتا ہے۔ نواب صاحب چھتاری نے کہا کہ سر محمد یامین خاں تائید کریں گے۔ مسٹر جناح نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ تائید کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ابھی تک ریزولیوشن کے الفاظ کو صحیح نہیں سمجھ سکا چونکہ یہ ابھی لائے ہیں اس لیے میں تائید نہیں کرتا۔ چونکہ ترمیم کی تائید نہیں ہوئی۔ سبجکٹ کمیٹی نے اصل ریزولیوشن پاس کر دیا۔

شام کو کھلے اجلاس میں پیش ہوا جس میں تقریباً پچاس ہزار آدمی تھے۔ اگرچہ بعض کا خیال ایک لاکھ ہے۔ مولوی فضل الحق سے ریزولیوشن عام جلسے میں پیش کرایا گیا۔ سب صوبوں کے لوگوں سے تائید کرائی گئی۔ یوپی سے چودھری خلیق الزمان سے جو چار سال قبل تک پکے" کانگریسی تھے اس لیے تائید کرائی گئی کہ یہ اس سے منحرف ہو کر کانگرس سے پھر نہ جا ملیں ریزولیوشن کو مجمع نے باآواز بلند پاس کر دیا اور سب طرف نعرے لگے۔ ریزولیوشن کے اہم حصے کا ترجمہ یہ ہے:

"مسلم لیگ کے اس جلسہ کی پورے غور و خوض کے بعد یہ رائے ہے کہ اس ملک میں کوئی آئین قابلِ عمل نہ ہوگا اور نہ مسلمانوں کو منظور ہوگا جب تک وہ ان اصولوں کی بنیاد پر نہ بنایا جائے کہ جغرافیائی طور پر مسلسل ملحقہ اراضیات کے ضروری ردوبدل کے بعد ایسے علاقے بنائے جائیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جس طرح شمال ومغربی ہندوستان و شمال ومشرقی ہندوستان کے علاقے ہیں ان کو یکجا ملا دیا جائے اور ان کو آزاد ملک کی حیثیت حاصل ہو لیکن ہر حصہ کو جو ان علاقوں میں شامل کیے جائیں ان کو خود مختاری دی جائے۔ ان علاقوں

میں اور ان کے صوبوں میں بذریعہ آئین اقلیتوں کے مذہب۔ تہذیب۔ تمدن اقتصادیات۔ سیاسی و حکومت میں حصّہ کے حقوق و دیگر حقوق کا تحفظ ان کے مشورے سے کیا جائے۔ اسی طرح اُن علاقوں میں اور ان کے حصّوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے تحفظ کے واسطے کافی پُر اثر اور عملی دفعات آئین میں درج ہوں جن کے ذریعے سے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مذہب، تہذیب، اقتصادی امور۔ سیاسی و حکمرانی میں حصّہ و دیگر حقوق کا تحفظ ان کے مشورے سے کیا جائے۔

یہ سیشن مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان اصولوں پر آئین تیار کرے جس میں جدا علاقوں کو اختیارات دیے جائیں اور دفاع، امور خارجہ، مواصلات۔ نقل و حمل کسٹم و دیگر مسائل کی بابت بھی طے کرے۔"

اس ریزولیوشن کے بنانے میں سر سکندر حیات خاں کا کافی ہاتھ تھا اور انھوں نے اپنی زونل اسکیم کو بھدے الفاظ میں درج کیا ہے .....

اعداد حسب ذیل ہیں جو ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں:۔

آبادی پنجاب

کمشنری انبالہ:

ضلع	مسلمان	ہندو	سکھ	کل
حصار	۲,۵۳,۷۸۴	۵۸۳۴۲۰	۵۵,۱۶۹	۸,۹۹,۴۷۹
روہتک	۱,۳۷,۸۸۰	۶,۵۵,۹۶۳	۵۹۶	۸,۰۵,۶۲۱
گڑگانواں	۲,۴۲,۲۵۷	۴,۹۳,۱۷۴	۵۰۰	۷,۴۰,۱۶۳
کرنال	۲,۵۹,۷۳۰	۵,۶۵,۲۸۶	۱۶۹۲۸	۸,۵۲,۶۱۴
انبالہ	۲,۳۰,۸۳۷	۳,۴۶,۷۱۱	۱,۵۵,۵۵۵	۷,۴۲,۹۰۲
شملہ	۵,۸۱۰	۲۸۶۶۱	۷۶۰	۳۶,۷۸۶

کمشنری جالندھر:

کانگڑا	۴۰،۴۸۳	۷،۳۱،۲۱۵	۲۳۹۶	۸،۶،۳۱۲
ہوشیارپور	۳،۲۸،۰۷۸	۴۱۴۳۵۳	۱۷۳۱۴۷	۱۰،۳۲،۱۸۷
جالندھر	۴،۱۹،۵۵۶	۱۵۵۲۴۲	۲۴۹۵۷۱	۹،۴۳،۷۲۱
لدھیانہ	۲،۳۵،۵۹۸	۱۰۲۴۴۱	۳۱۲۸۲۹	۶،۷۲،۴۹۴
فیروزپور	۵،۱۵،۴۳۰	۲۰۸۴۲۶	۳،۸۸،۱۰۸	۱۱،۵۶،۷۳۲

کمشنری لاہور

ضلع	مسلمان	ہندو	سکھ	کل
لاہور	۸،۱۵،۸۲۰	۲،۵۸،۷۱۹	۲،۴۴،۳۰۴	۱۳،۷۸،۵۷۰
امرتسر	۵،۲۴،۶۷۶	۱،۷۴،۳۹۲	۳،۹۹،۹۵۱	۱۱،۱۷،۱۲۰
گورداسپور	۴،۹۳،۲۱۶	۲،۴۹،۴۰۴	۱،۷۸،۴۷۱	۹،۷۰،۸۹۸
سیالکوٹ	۶،۰۹،۶۳۳	۲۰۶۳۹۵	۹۴۹۵۵	۹،۷۹،۶۱۷
گوجرانوالہ	۵،۲۱،۳۴۳	۹۲۷۶۲	۷۱۵۵۹	۷،۳۶،۱۳۸
شیخوپورہ	۴،۴۵،۹۹۶	۷۰۱۴۶	۱۱۹۴۷۷	۶،۹۶،۷۳۲

کمشنری راولپنڈی:

گجرات	۷،۸۶،۷۵۰	۷۲۳۴۶	۵۹۱۸۸	۹،۲۲،۴۶۷
شاہ پور	۶،۷۹،۵۴۶	۸۸۹۷۰	۴۰۰۷۴	۸،۲۱،۴۹۰
جہلم	۴،۷۲،۰۹۷	۳۶۰۶۸	۲۲۰۳۰	۵،۴۱،۰۷۶
راولپنڈی	۵،۲۴،۹۶۵	۵۹۴۸۵	۴۱۲۸۵	۶،۳۴،۳۵۷
اٹک	۵،۳۱،۷۹۳	۳۱۹۳۲	۱۹۵۲۲	۵،۸۳،۹۶۰
میانوالی	۳،۵۷،۱۰۹	۴۹۷۹۴	۴۲۲۱	۴،۱۱،۵۳۹

کمشنری ملتان :

منٹگمری	۶,۹۷,۵۴۲	۱۲۰۶۶۴	۱۴۸۱۵۵	۹,۹۹,۷۷۲
لائل پور	۷,۲۰,۹۹۶	۱,۲۲,۶۲۶	۳۱۱۳۹۱	۱۱,۵۱,۳۵۱
جھنگ	۵,۵۲,۸۵۳	۱۰۲۹۲۴	۸۴۷۶	۶,۶۴,۸۳۳
ملتان	۹,۴۲,۹۳۷	۱,۷۷,۱۰۲	۳۹۴۵۳	۱۱,۷۴,۹۰۰
مظفرگڑھ	۵,۱۳,۲۶۵	۱۷۲۵۷۷	۵۲۸۷	۵,۹۱,۳۷۵
ڈیرہ غازی خاں	۴,۳۲,۹۱۱	۵۷۲۱۷	۷۶۰	۴,۹۱,۰۴۴

کمشنری سرحد :

ضلع	مسلمان	ہندو	سکھ	کُل
بلوچ ٹرانس فرنٹیر	۲۹,۴۶۹	۱۷۳	۰۰۰۰۰	۲۹,۶۹۲

آبادی بنگال

کمشنری بُردوان :

بُردوان کمشنری	۱۲,۲۲,۷۷۹	۷۱,۶۴,۴۴۱		۸۶,۴۷,۱۸۹
بُردوان ضلع	۲,۹۲,۴۷۱	۱۲,۳۸,۸۷۲	۰	۱۵,۷۵,۶۹۹
بیربھوم	۲,۵۲,۹۰۸	۶۳۶۴۲۵	۰	۹,۴۷,۵۵۴
بانکوڑہ	۵۱,۰۱۲	۱۰,۱۱,۶۵۴	۰	۱۱,۱۱,۷۲۱
مدناپور	۲۰۱۲,۴۷۳	۲۴,۹۲,۹۸۹	۰	۲۷,۹۹,۹۳
ہگلی	۱,۸۰,۲۱۷	۹,۲۴,۰۶۱	۰	۱۱,۱۴,۲۵۵
ہاوڑہ	۲,۳۳,۶۹۶	۸,۶۰,۴۴۰	۰	۱۰,۹۱,۸۶۷

کمشنری پریسیڈنسی :

۲۴ پرگنہ	۹,۱۳,۲۲۳	۱۷,۴۲,۳۸۷	•	۲۷,۱۳,۸۷۴
کلکتہ	۳,۱۱,۱۵۵	۸,۲۲,۲۹۳	•	۱۱,۹۶,۷۳۴
ندیا	۹,۴۴,۹۱۵	۵,۷۴,۰۴۵	•	۱۵,۲۹,۶۳۲
مرشدآباد	۷۶۱۵۸۲	۵,۸۹,۵۵۱	•	۱۳,۷۰,۶۷۷
جیسور	۱۰,۳۵,۳۷۱	۶,۳۴,۲۳۰	•	۱۶,۷۱,۱۶۴
کھلنا	۸۰۴۹۰۹	۸,۱۶,۶۲۰	•	۱۶,۲۶,۱۴۸۰

کمشنری راجشاہی :

ضلع	مسلمان	ہندو	کل
راج شاہی	۱۰,۸۳,۱۰۵	۳,۲۶,۰۱۸	۱۴,۲۹,۰۱۸
دیناج پور	۸۰۱۶۷۲۳	۷۹۳۸۳۲	۱۷,۵۵,۴۳۲
جلپائی گوری	۲۲۵۹۵۱	۶۶۴۰۱۵	۹۸۳۳۵۷
دارجلنگ	۸۳۹۱	۲۳۶۹۱۳	۳۱۹۶۳۵
رنگ پور	۱۸۳۶۸۴۰	۷۴۶۵۴۶	۲۵۹۴۷۸۵
بوگرہ	۹۰۵۶۳۸	۱۷۷۶۲۹	۱۰۸۵۴۱۹
پبنا	۱۱۱۱۷۱۲	۳۳۲۳۶۷	۱۴۴۵۶۵۴
مالدہ	۵۷۱۹۵۳	۴۴۴۴۱۶	۱۰۵۳۷۶۶

کمشنری ڈھاکہ :

ڈھاکہ	۲۲۹۳۳۹۶	۱۱۲۴۸۹۳	۳۴۳۲۵۷۷
میمن سنگھ	۳۹۲۷۵۵۲	۱۱۷۴۳۲۸	۵۱۳۰۲۶۲
فرید پور	۱۵۰۷۱۵۷	۸۴۷۰۶۴	۲۳۶۲۲۱۵
باقر گنج	۲۱۰۵۱۸۴	۸۱۲۵۸۵	۲۹۳۹۰۵۰

کمشنری چٹاگانگ :

پٹرھ	۲۳۵۶۶۰۹	۷۵۰۷۲۴	۳۱۰۹۷۳۵

نواکھالی	۱۳،۳۹،۰۵۵	۳۶۶۳۹۱	۱۷،۰۶،۷۱۹
چٹاگانگ	۱۳،۲۶،۲۰۸	۳۹۲۳۵۲	۱۷،۹۷،۰۳۸
چٹاگانگ پہاڑی علاقے	۸،۲۱۶	۳۶،۷۷۶	۲،۱۲،۹۲۲

اس مردم شماری کی فہرست دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ ریزولیوشن کے غلط الفاظ کو اضلاع سمجھا جائے گا۔ اس طرح مسلمان کل کمشنری انبالہ وکل کمشنری جالندھر کے اضلاع میں اور ضلع امرتسر میں اکثریت میں یعنی نصف سے زیادہ نہیں ہیں یہ تو پنجاب کا حال ہے۔

ادھر بنگال میں ساری بردوان کمشنری کے اضلاع۔ پریسیڈنسی ڈویژن کے تین اضلاع چوبیس پرگنہ وکلکتہ وکھلنا میں اور راج شاہی کمشنری میں جلپائی گوڑی دوارجلنگ میں ہم اقلیت میں ہیں اس لیے ریزولیوشن کے الفاظ ایسے ہیں کہ جن سے مراد مسلسل اضلاع لی جا سکتی ہے۔ اس میں ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔ چوں کہ یونٹ سے مراد ضلع بھی ہے۔ تحصیل بھی ہو سکتی ہے۔ تھانہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک گاؤں بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری ردّوبدل کا لفظ درست ہے کہ اگر بیچ میں کوئی ایسا علاقہ آجائے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور اس کے چاروں طرف مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دُور سے چلی آئی ہے تو یہ علاقہ بھی مسلم علاقہ میں شمار ہوگا۔ اسی طرح گھرا ہوُا مسلم علاقہ ہندوؤں کے علاقے میں جائے گا لیکن اس کی وضاحت ضروری ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ضلع جالندھر جہاں ہم بڑی اکثریت میں ہیں اگرچہ ہم نصف سے زیادہ نہیں ہیں لیکن مسلسل دیہات لیے جائیں اور دیسی ریاستوں کو بھی شمار کیا جائے تو ہم اکثریت میں ہیں۔ کپورتھلہ و مالیر کوٹلہ کی ریاستیں مسلم اکثریت کی ریاستیں ہیں فرید کوٹ، نابھہ اور پٹیالہ کے بعض علاقوں میں مسلم اکثریت ہے۔ جالندھر نہایت مردم خیز ضلع ہے، اور یہاں کے لوگ کھیلوں میں بہت مشہور ہیں ......
کس قدر افسوس ہوگا اگر یہ ضلع پاکستان سے نکل گیا۔ چونکہ اس ریزولیوشن کو سب اخبارات نے پاکستان کا ریزولیوشن کہنا شروع کر دیا ہے۔

جب مسٹر جناح دہلی واپس آئے میں نے ان کو مردم شماری کی فہرست دکھائی اور کہا کہ ریزولیوشن کے الفاظ غلط ہیں اگرچہ آپ نے ۲۲ مارچ کی رات کو جو تقریر کی تھی اس کے الفاظ یہ تھے " انگریزوں کے بنائے ہوئے نقشہ تک میں ہم بہت صوبوں میں اکثریت میں ہیں جیسے بنگال، پنجاب، صوبہ سرحدی و بلوچستان ہیں "
میں اسی لیے ۲۳ مارچ کی صبح کو نواب صاحب چھتاری کی ترمیم کی تائید نہ کر سکا چوں کہ میں ریزولیوشن کے الفاظ کو مہمل سمجھتا تھا۔
مسٹر جناح نے کہا کہ مجھ کو یقین دلایا گیا تھا کہ پنجاب میں کمشنری انبالہ اور بنگال میں کمشنری بردوان میں صرف ہم اقلیت میں ہیں باقی سب جگہ ہماری اکثریت ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے ناواقفوں پر یہ کام چھوڑا مجھ سے کہتے تو میں آپ کو یہ فہرست پہلے سے دیتا اور ریزولیوشن کو لاہور جا کر نہیں لکھنا تھا یہاں مشورہ سے لکھا جاتا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ سر سکندر حیات خاں اور مولوی فضل الحق صوبائی وزراے اعظم ہیں میں نے ان پر اعتبار کیا۔ میں نے کہا کہ میں دیکھا کرتا تھا کہ سر عبداللہ ہارون کے یہاں پیر علی محمد راشدی اور ایک علی گڑھ کا طالب علم اعداد نکالا کرتے تھے مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے بنائے ہوئے اعداد پر سر سکندر بھروسا کریں گے۔ غالباً ان لڑکوں نے صرف یہ دیکھا کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی کہاں کہاں ہے یہ نہ دیکھا کہ سب غیر مسلموں کو ملا کر بھی ہم زیادہ ہیں یا نہیں۔ ہندوؤں سے بھی زیادہ ہیں۔ سکھوں سے بھی زیادہ۔ لیکن غیر مسلموں کی مجموعی آبادی سے ہم زیادہ نہیں۔ مسٹر جناح نے کہا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ایک وضاحتی بیان جاری کریں کہ ریزولیوشن کا وہی مطلب ہے جو آپ نے ۲۲ مارچ کی رات کو کہا تھا یعنی کل بنگال اور کل پنجاب۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ابھی خاموش رہو اور کسی کو یہ مت بتانا میں کئی دن بعد موقع سے بیان جاری کروں گا۔ میں نے کہا کہ اسمبلی میں اور لابی میں میں نے ہندوؤں کو یہ گفتگو کرتے سنا ہے کہ اس ریزولیوشن کا کیا مطلب ہے، اور کہاں کہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور غالباً انھوں نے بھی یہ اعداد نکالے ہیں اس لیے جلد ہی وضاحت کر دی جائے۔ اور یوپی و بہار میں جہاں جہاں ہم اکثریت میں ہیں ان کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ مسٹر جناح نے کچھ دن بعد یہ بیان جاری کر دیا کہ ہمارا مطلب کل پنجاب و بنگال سے ہے۔

سر محمد یامین خاں کے بیان کا آخری جملہ یہ ہے:

"مسٹر جناح نے کچھ دن بعد یہ بیان جاری کر دیا کہ ہمارا مطلب کل پنجاب و بنگال سے ہے۔"

بلاشبہ یہ بیان جاری کیا گیا۔ اس میں بعض وضاحتیں ہیں۔ سکھوں اور ریاستوں کو بعض یقین دہانیاں بھی کرائی گئی ہیں لیکن جس بات کی طرف محمد یامین خاں نے اشارہ کیا ہے، وہ بالکل نہیں کہ قرارداد میں مسلم اکثریت کے علاقوں سے کیا مراد ہے؟ جانبار مرزا نے انقلاب کے حوالے سے یہ بیان نقل کر دیا ہے:

"۳۱ مارچ مسٹر جناح نے لاہور قرارداد کے متعلق ایک وضاحتی بیان میں کہا کہ "تقسیم کی تجویز کا یہ مطلب نکالنا غلطی ہے کہ اقلیتوں کو ایک علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں آباد ہونا پڑے گا۔ ممکن ہوا تو آبادیوں کے تبادلے پر غور کیا جائے گا۔ اصل پوزیشن یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔"

سکھوں کی پوزیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"شمال مغرب میں جو اسلامی علاقہ ہوگا، اس میں سکھوں کی حالت ان کی آل انڈیا جنتا سے اچھی رہے گی۔ اس کے برعکس مرکزی حکومت کے تحت ان کی آواز کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔"

ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

"ان کی بیشتر تعداد شمال مغربی حصے میں ہے۔ مثلاً کشمیر، بہاول پور۔ اگر یہ ریاستیں اسلامی فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادہ ہوں تو مسلم لیگ ان سے سمجھوتہ کے لیے تیار ہے، لیکن انھیں کسی سمجھوتہ کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔"

(روزنامہ "انقلاب" لاہور ۲ اپریل ۱۹۴۰ء)

محمد یامین خاں کے مشورے کے مطابق بیان دینے کے باوجود وہ خاص وضاحت

نہ کرنا اس بات کا اشارہ ہے کہ شاید وہ یامین خاں کی رائے سے متفق نہ تھے۔
"خطبات قائداعظم" مرتبہ سید رئیس احمد جعفری اور "گفتار قائداعظم" مرتبہ
پروفیسر احمد سعید میں یہ بیان نہیں ہے۔

استدراک

سب کمیٹی کا قیام اور اس کا پس منظر

ایک ضروری بحث جو ابھی تحریر میں نہیں آسکی، یہ ہے کہ یہ سب کمیٹی جس نے پاکستان اسکیم مرتب کی تھی کب قائم ہوئی تھی اور اس کا واقعی پس منظر کیا تھا؟ اس واقعے اور اس کے پس منظر پر خان عبدالولی خان کی دستاویزی تالیف " حقائق ـــ حقائق ہیں " سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتائج نے مسلم لیگ کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی، لیکن مسلم اکثریت کے کسی صوبے میں بھی اس کی حکومت نہ تھی۔ صورت حال یہ تھی۔

۱ ـــ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ نہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کوئی کھڑا ہوا تھا، نہ کامیاب ہوا۔

۲ ـــ صوبہ سندھ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ نہ مسلم لیگ کا یہاں کوئی وجود تھا، نہ اس کا کوئی نمائندہ تھا۔

۳ ـــ صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کے دو نمائندے کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک (سر فیروز خان نون) کامیابی کے اعلان کے فوراً بعد مسلم لیگ چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔

۴ ـــ بلوچستان کو صوبائی درجہ اور اس کے حقوق ہی حاصل نہ تھے۔ اس لیے انتخابات کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوا تھا۔

گویا کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشن میں پورے پاکستانی علاقے سے پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کا صرف ایک نمائندہ پنجاب میں منتخب ہوا تھا۔ اس صورت حال کے باوجود مسلم لیگ چاہتی تھی کہ کسی صوبے میں کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔ وائسرائے اور وزیر ہند کے لیے مشکل تھا کہ وہ صوبوں میں کامیاب اکثریتی پارٹیوں کو نظر انداز کر دے۔ اگر ایسا کرے تو انگلستان میں پارلیمنٹ کو کیا جواب دے اور کیوں کر مطمئن کرے۔ وائسرائے نے یہ بات مسلم لیگ کے رہنماؤں پر واضح کر دی تھی کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اقلیت کو یہ اختیار دے کہ وہ اکثریت کا راستہ روکے اور آئینی اور جمہوری مطالبات کو مسترد کر دے۔ مہذب دنیا ایسی کسی بات کو قبول نہیں کر سکتی۔ اس لیے انھیں کوئی مثبت (Positive) اور تعمیری (Constructive) تجویز پیش کرنی چاہیے۔ وائسرائے نے یہ بات سر سکندر حیات سے بھی کی تھی اور وزیر ہند کو لکھا تھا

> وہ (سکندر حیات) کہتا ہے کہ میں تمھاری (وائسرائے کی) اس بات کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کروں گا۔۔
>
> چناں چہ اس منصوبے کے مطابق
>
> ایک سب کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ۳۔ فروری ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں بنائی گئی۔ (۱)

۲ ـــ اس کا کام یہ تھا کہ وہ کوئی ایسی مثبت اور تعمیری تجویز پیش کرے گی۔ جس سے مسلم لیگ کا مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ بھی سچا ثابت ہو جائے اور برٹش مفادات کو تحفظ بھی مل جائے۔
۳ ـــ یہ بات شک سے بالا ہے کہ یہ کمیٹی وائسرائے کے ایما سے بنائی گئی تھی اور اس کے لیے سر سکندر حیات اور ان کے ساتھ اے۔ کے۔ فضل الحق وغیرہ کو استعمال کیا گیا تھا۔
۴ ـــ سکندر حیات نے وائسرائے سے پہلے ہی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ۳۔ فروری کے اجلاس کی کارروائی سے بھی اسے (وائسرائے کو) راز داری کے ساتھ مطلع کریں گے۔ وائسرائے کے الفاظ جو اس نے وزیر ہند کو لکھے تھے، یہ ہیں:

"He would let me know confidentially how matters went in the meeting of the Muslim League working committee on 3rd Feb."

(حقائق۔ حقائق ہیں. ص ۵۲)

۵ ـــ چناں چہ اگلے ایک دو روز میں سکندر حیات اور فضل الحق نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ اس کی تجویز کے مطابق سب کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ وائسرائے نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اب میں یہ جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں کہ کمیٹی کیا تجویز کرتی ہے۔ وائسرائے کے الفاظ یہ ہیں:

"That I should be interested to learn that the W.C. of the M.L. has now instructed a sub-committee to draft a constructive programme. I said I was delighted to hear it and that I should await its terms with the greatest interest."

(ایضاً، ص ۵۳)

۶ ـــ بہ قول ولی خان ۶۔ فروری کو صدر مسلم لیگ مسٹر محمد علی جناح نے خود وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے کمیٹی کی تمام کارروائی سے آگاہ کیا اور پھر دریافت کیا کہ اب انھیں یعنی مسلم لیگ کو کیا کرنا چاہیے؟ وائسرائے کے مراسلے بنام وزیر ہند کے الفاظ یہ ہیں:

"After the usual compliments he (Jinnah) opened the proceedings by asking me what were we to do assuming that we meant Muslim league."

(ایضاً، ص ۵۳)

مسلم لیگ، کانگریس، برعظیم پاک و ہند کی آزادی اور اس کی مختلف اسکیموں کے بارے میں انگریزوں کے خیالات میں اتار چڑھاؤ ہوتے رہے ہیں۔ یوں بدلتے ہوئے تو کہیں طریقہ کار تبدیل ہوا ہے۔ شاید کسی ایسے ہی موقع پر پاکستان اسکیم سے انگریزوں کی عدم دل چسپی دیکھ کر اس کے مسلم لیگ کی اسکیم ہونے سے انکار کر دیا گیا ہو! (۲)

****

(۱) یہ اجلاس دہلی میں لیاقت علی خان کے مکان " گل رعنا " میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا۔
پاکستان کی اسکیم، اس کی تاویلات، انگریزوں کی اس سے دل چسپی اور مسلم لیگ کی بہ حیثیت انگریزوں کے مفادات کی محافظ جماعت کے تفصیلی مطالعے کے لیے " حقائق ـــ حقائق ہیں " کا مطالعہ کیجیے۔ (صفحہ ۴۱ تا ۵۲ اور اس کے بعد)۔

مجلسِ یادگارِ مہر



Maktaba-e-Shahid

RS, 75/-

مکتبۂ شاہد ۱/۹۔ علی گڑھ کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰